Phone: 7500

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

اگست 1962ء

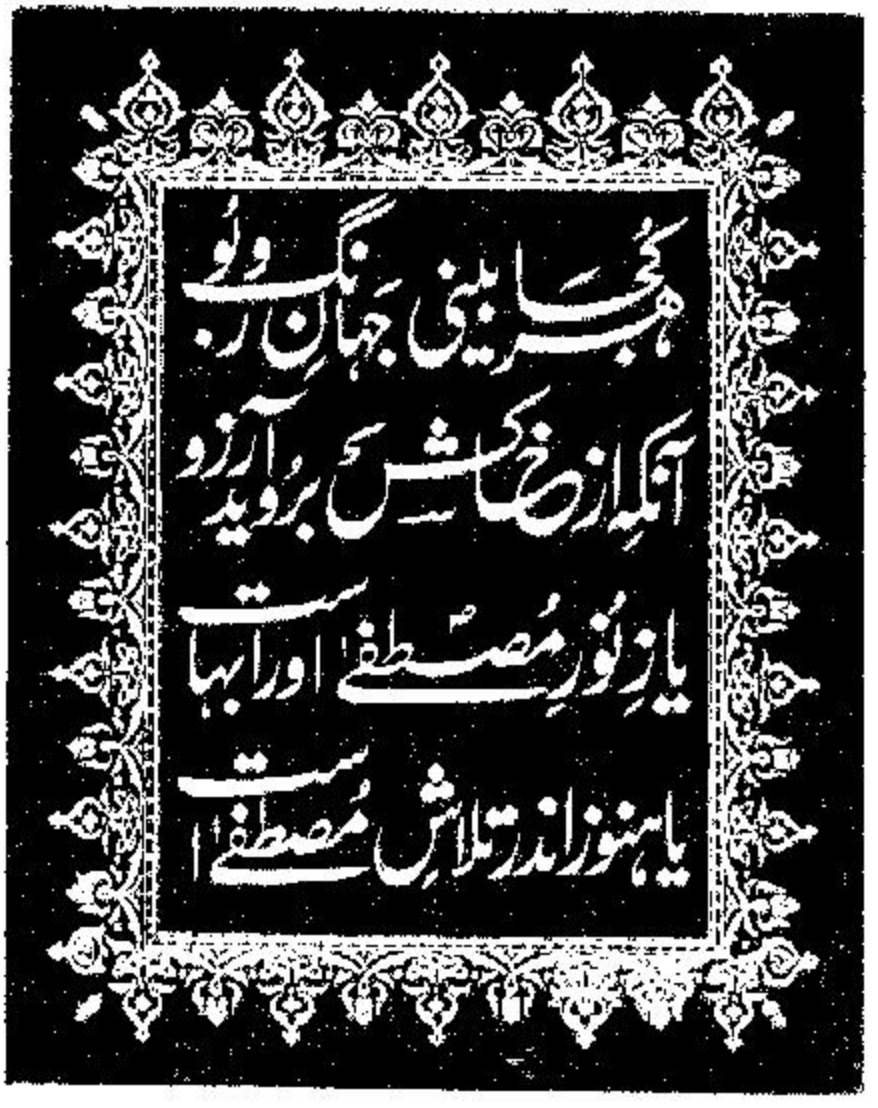

بتقریب
سعید

عید
میلاد النبی

طابع و ناشر

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵-بی گل برگ لاہور

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

بدلِ اشتراک
ہندوپاکستان سے سالانہ — آٹھ روپے
غیر ممالک سے سالانہ — ۱۶ شلنگ

قیمت فی پرچہ
— ہندوپاکستان سے —
۷۵ نئے پیسے

ٹیلیفون نمبر ۷۵۰۰

— خط وکتابت کا پتہ —
ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ - لاہور

جلد ۱۵ | اگست ۱۹۶۲ء | نمبر ۸

فہرست مضامین

لمعات ——— (۲)
عائلی قوانین ——— (۱۳)
نذرِ عقیدت بحضور رسالتمآب ——— (محترم پرویز صاحب) ——— (۳۳)
پاکستان اور اسلامی کلچر ——— (پروفیسر شمیم انور صاحب) ——— (۴۹)
سالارِ انسانیت ——— (صفدر سلیمی) ——— (۵۶)
ہماری اسمبلی کا پہلا کارنامہ ——— (سیاسی پارٹیوں کا قانون) ——— (۶۸)
رابطۂ باہمی ——— (۷۶)

لمعات

(ڈرو اُس سے جو وقت ہے آنے والا)

مملکتِ پاکستان کی سب سے پہلی منتخب مجلس قانون ساز (نیشنل اسمبلی) کا پہلا اجلاس بڑی دھوم دھام سے منعقد ہوا اور بڑی ہنگامہ خیزیوں کے بعد ختم ہو گیا۔ اس اجلاس کی کارروائی ساتھ کے ساتھ اخبارات میں شائع ہوتی رہی، اس لئے اسے دُہرانے کی ضرورت نہیں۔ اس تمام تگ و تاز کا ماحصل، دو شقوں میں سامنے آیا۔ ایک یہ کہ اسمبلی نے سیاسی پارٹیوں کے جواز کا قانون پاس کر دیا۔ اور دوسرے یہ کہ اس نے عائلی قوانین کی تنسیخ کے مسودہ قانون پر اسلامی مشاورتی کونسل کی رائے طلب کرنے کا فیصلہ کیا (ہم، ان ہر دو امور کا، آئندہ صفحات میں، تفصیلی جائزہ لے رہے ہیں)۔ اس دوران میں ہم منتظر رہے کہ اسمبلی کے کسی گوشے سے اُس مسئلہ کے متعلق بھی کوئی آواز اُٹھے جو ہمارے نزدیک، سب سے مقدم، سب سے اہم۔ اور سب سے نازک تھا۔ لیکن ہماری مایوسی کی انتہا نہ رہی جب ہم نے دیکھا کہ اس کے متعلق کسی نے ایک حرف تک بھی نہ کہا۔ ایسا نظر آتا ہے کہ کسی کو اس کی اہمیت کا اندازہ ہی نہیں ہوا۔

نیشنل اسمبلی کی تشکیل کا بنیادی مقصد ایک، اور صرف ایک ہے۔ یعنی ملک کے لئے قانون سازی۔ یہی اس کے وجود کی وجہِ جواز ہے۔ اس لئے بجا طور پر توقع کی جا سکتی تھی کہ یہی مسئلہ، سب سے پہلے، اسمبلی کے زیرِ غور آئے گا۔ لیکن، جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے، اس طرف کسی نے آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ کسی کو اس کا خیال تک بھی نہ آیا کہ یہ سوال بھی کسی غور و فکر کا محتاج ہے۔

۲۔ آئینِ نو کی بنیادی شق یہ ہے کہ

کوئی ایسا قانون مدوّن نہیں کیا جائے گا جو اسلام کے خلاف ہو۔

ہمارے نزدیک جو سوال سب سے پہلے اسمبلی کے اراکین کے زیرِ غور آنا چاہیئے تھا' یہ تھا کہ جو مسودۂ قانون ہمارے زیرِ بحث آئے گا - یا جسے ہم پاس کریں گے اس کے متعلق کس طرح فیصلہ کیا جائے گا کہ وہ اسلام کے خلاف ہے یا نہیں؟ سطح بین نگاہیں تو، طنز و استخفاف کی ہنسی کے ساتھ کہہ دیں گی کہ یہ بھلا کونسا مشکل سوال ہے جس پر سب سے پہلے، غور و فکر کی ضرورت لاحق ہوتی - لیکن جن کی نگاہیں حقائق پر ہیں وہ ہم سے متفق ہوں گے کہ یہ سوال ایسا آسان نہیں جیسا اسے سطحی طور پر سمجھ لیا جاتا ہے۔ اس کی مشکل کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب (۱۹۵۳ء میں) "فسادات پنجاب کی تحقیقاتی کمیٹی" نے مختلف علمائے کرام سے پوچھا تھا کہ

مسلمان کسے کہتے ہیں

تو اس کا کوئی متفق علیہ اور متعین جواب نہیں مل سکا تھا۔ سو ظاہر ہے کہ جب ہمارے علماء حضرات (جنہیں امور مذہبی کے ماہر ہونے کا دعوے ہے) یہ نہیں بتا سکتے کہ مسلمان کسے کہتے ہیں' تو اسمبلی کے ممبران (جو بہر حال' امور مذہبی سے اس قدر بہرہ ور نہیں) اس سوال کا جواب بآسانی کس طرح دے سکیں گے کہ

یہ کیسے فیصلہ کیا جائے گا کہ فلاں قانون اسلام کے خلاف ہے یا نہیں۔

اگر آئین میں یہ لکھا ہوتا کہ کوئی ایسا قانون پاس نہیں کیا جائے گا جو (مثلاً) ہدایہ (فقہ حنفی کی کتاب) کے خلاف ہو' تو اس سوال کے جواب میں کوئی دشواری نہ ہوتی - یا مثلاً یہ شرط ہوتی کہ کوئی ایسا قانون نافذ نہیں کیا جائیگا جو بخاری (حدیث کی کتاب) کے خلاف ہو' تو بھی بات مشکل نہ ہوتی - یا یہ اصول ہوتا کہ کوئی ایسا قانون مرتب نہیں کیا جائے گا جو قرآن کریم (اللہ کی کتاب) کے خلاف ہو' تو بھی بات آسان ہوتی - لیکن جب شرط یہ ٹھہری کہ کوئی ایسا قانون پاس نہیں کیا جائے گا جو اسلام کے خلاف ہو' تو بات ایسی آسان نہیں رہتی کہ اسے یونہی ٹال دیا جائے - ہمارے صدرِ اول میں' اس معاملہ میں واقعی کوئی دشواری پیش نہیں آسکتی تھی - اُس وقت امت کا ایک مرکز موجود تھا (یعنی رسول اللہؐ اور حضورؐ کے بعد' خلافت علیٰ منہاج رسالت) - وہ مرکز جس بات کے متعلق کہہ دیتا کہ وہ اسلام کے مطابق ہے' اسے 'متفقہ طور پر' اسلام کے مطابق سمجھا جاتا - جس کے متعلق فیصلہ کر دیتا کہ وہ اسلام کے خلاف ہے' وہ اسلام کے خلاف قرار پا جاتی - لیکن اب' جبکہ مسلمانوں میں اس قدر فرقے پیدا ہو چکے ہیں - اور ہر فرقہ کا اسلام کا تصور الگ الگ' اور اسلام کے قوانین جداگانہ ہیں' مختلف فرقوں کے نمائندوں پر مشتمل اسمبلی کے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہی نہیں' (بلکہ اکثر صورتوں میں) ناممکن ہوگا کہ فلاں بات اسلام کے خلاف ہے یا مطابق - اگر آپ اس کا عملی ثبوت چاہتے ہیں تو یوں کیجئے کہ (کوئی پیچیدہ قانونی مسئلہ تو ایک طرف)' اسمبلی کے ممبران سے کہئے کہ وہ اس آسان سے سوال کا متفق علیہ جواب دیں کہ

بیوی کو طلاق دینے کا کونسا طریقہ اسلام کے مطابق ہے۔

میران اسمبلی کو بھی چھوڑ دیجئے۔ مختلف فرقوں کے حضرات علمائے کرام سے کہیئے کہ وہی اس سوال کا متفق علیہ جواب دیں! اسے "ٹسٹ کیس" بنایئے اور پھر خود دیکھ لیجئے کہ اس کا نتیجہ کیا نکلتا ہے؟ دور نہ جایئے۔ (مثلاً) مولانا داؤد غزنوی صاحب اور مفتی محمد شفیع صاحب سے کہیئے کہ وہ طلاق کے متعلق ایک ایسا قانون مرتب فرما دیں جس کا اطلاق، اہل حدیث اور حنفی، دونوں پر یکساں طور پر ہو سکے۔ یا ... مودودی صاحب سے کہیئے کہ وہ ایسا کر دکھائیں۔ بات صاف ہو جائے گی۔

۳۔۔۔ اس مشکل میں آسانی پیدا کرنے کے لئے، آئین میں یہ تجویز کیا گیا ہے کہ ایک "اسلامی مشاورتی کونسل" متشکل کی جائے جس سے یہ دریافت کیا جایا کرے کہ جو قانون زیر بحث آنے والا ہے، وہ اسلام کے مطابق ہے یا اس کے خلاف۔ لیکن بادنیٰ تعمق یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ یہ تجویز اس مسئلہ کو آسان کرنے کے بجائے اس قدر دشواریاں اور پیچیدگیاں پیدا کرے گی جس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً

(۱) مشاورتی کونسل کا وہ شعبہ جس کا تعلق امور شریعت سے ہوگا، اگر مختلف فرقوں کے نمائندگان پر مشتمل ہوا، تو بہت کم امور ایسے ہوں گے جن میں ان کی رائے متفق علیہ ہوگی۔ سوچیئے کہ ایسی صورت میں اسمبلی کے ممبران کس نتیجے پر پہنچیں گے؟

(۲) آئین کی رو سے، مشاورتی کونسل کی حیثیت محض "مشاورتی" ہوگی۔ اسمبلی کے لئے لازمی نہیں ہوگا کہ وہ ہر معاملہ میں کونسل سے استصواب رائے کرے۔ نہ ہی اسمبلی اس کی پابند ہوگی کہ وہ کونسل کی رائے کو بالضرور تسلیم کرے۔

اب دیکھئے کہ اس صورت حالات کا نتیجہ کیا ہوگا؟ (مثلاً) کسی بل (مسودہ قانون) کے متعلق، کونسل کی رائے یہ ہے کہ وہ خلاف اسلام ہے۔ اسمبلی، کونسل کی اس رائے کو تسلیم نہیں کرتی اور بل پاس کر دیتی ہے۔ وہ بل منظور ہو کر ملک کا قانون بن جاتا ہے۔ آئین کی رو سے، یہ قانون، اسلامی تسلیم کیا جائے گا۔ اس لئے کہ آئین میں کہا یہ گیا ہے کہ کوئی ایسا قانون پاس نہیں کیا جائے گا جو اسلام کے خلاف ہو۔ اس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ اسمبلی جو قانون بھی پاس کرے گی اسے آئینی طور پر اسلامی تصور کیا جائے گا۔ بالفاظ دیگر، جس قانون کو اسلامی مشاورتی کونسل نے غیر اسلامی قرار دیا تھا، اسے آئین پاکستان، اسلامی تصور کرے گا اور وہ اسلامی قانون کی حیثیت سے ملک میں نافذ ہوگا۔ اب ملک میں دو مخالف روشیں چل نکلیں گی۔ حکومت اس قانون کو اسلامی قانون شریعت کی حیثیت سے نافذ کرے گی۔ اور ملک کا مذہبی طبقہ جس کے نمائندوں نے اس قانون کو

خلاف اسلام قرار دیا تھا، اسے خلاف شریعت ٹھیرائے گا۔ اس قسم کے اختلافی مشکل کے حل کے لئے آئین میں کوئی شق نہیں رکھی گئی۔ اس میں اگر یہ شق رکھ دی جاتی کہ ایسی صورت میں، عدالت عالیہ کی طرف رجوع کیا جائے گا۔ جہاں فریقین اپنے اپنے دلائل پیش کریں گے اور اس عدالت کا فیصلہ آخری ہوگا، تو بھی صورت تسلی بخش ہوتی۔ جب متخاصم فریقین کے سامنے جھگڑا مٹانے کا کوئی راستہ نہ ہو، تو اس بے بسی سے جو نفسیاتی کیفیت پیدا ہوتی ہے، اس کے نتائج واضح ہیں۔

(۳) اگر اس تناقض سے بچنے کے لئے، یا بیرونی پراپیگنڈہ سے دب کر، اسمبلی نے یہ روش اختیار کرلی، کہ مشاورتی کونسل جو رائے دے اسے بہرحال قبول کر لیا جائے، تو اس کا عملی مفہوم یہ ہوگا کہ ملک میں قانون سازی کے اختیارات، کونسل کے دو چار ممبروں میں سمٹ کر رہ جائیں گے۔ یہ تھیاکریسی کی بدترین مثال ہوگی۔ اس وقت وہی سوال سامنے آئے گا جسے جسٹس محمد منیر صاحب نے (تحقیقاتی کمیٹی کے سلسلہ میں) اٹھایا تھا کہ ایسی صورت میں، ایک منتخب اسمبلی کی تشکیل کی ضرورت کیا ہے؟ اگر اسمبلی کا فریضہ اتنا ہی ہے کہ وہ علماء حضرات کے فیصلوں پر صاد کرتی جائے، تو اتنے بڑے سفید ہاتھی کو باندھنے سے فائدہ کیا؟ اس کی صاف، سیدھی اور آسان شکل یہ ہونی چاہیئے کہ "جمہوریت" کی بساط کو سمیٹ کر الگ رکھ دیا جائے، اور قانون سازی کے جملہ اختیارات ایک "علماء بورڈ" کو سونپ دیئے جائیں۔

۴۔۔۔ اب آیئے اس مسئلہ کے نازک ترین گوشہ کی طرف۔ یعنی اس گوشہ کی طرف کہ حکومت نے (اسمبلی کی منظوری سے) ملک میں ایک قانون نافذ کر دیا، اور "ارباب شریعت" نے یہ فتویٰ صادر کر دیا کہ یہ قانون اسلام کے خلاف ہے، تو اس وقت کیا ہوگا؟ اس کا جواب سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے، ترجمان القرآن بابت مئی ۱۹۶۲ء میں کھلے الفاظ میں دیا ہے۔ انہوں نے پہلے یہ سوال درج کیا ہے،

> کیا عائلی قوانین کے نفاذ کے بعد، کوئی شخص اگر شریعت کے مطابق کسی قسم کی طلاق دے تو وہ واقع ہو جائے گی؟ متذکرہ صدر قوانین کی رُو سے تو طلاق کے نافذ ہونے کے لئے کچھ خاص شرائط عائد کر دی گئی ہیں۔

مودودی صاحب نے اس اہم سوال کا حسب ذیل جواب دیا ہے۔

> کسی حکومت کے قوانین سے نہ تو شریعت میں کوئی ترمیم ہو سکتی ہے اور نہ وہ شریعت کے قائم مقام بن سکتے ہیں۔ اس لئے جو طلاق شرعی قواعد کی رُو سے دیدی گئی ہو وہ عنداللہ اور عندالمسلمین نافذ ہو جائے گی خواہ ان قوانین کی رُو سے وہ نافذ نہ ہو۔ اور جو طلاق شرعاً

قابلِ نفاذ نہیں ہے وہ ہرگز نافذ نہ ہوگی، خواہ یہ قوانین اس کو نافذ کردیں۔ اب مسلمانوں کو خود سوچ لینا چاہیئے کہ اپنے نکاح و طلاق کے معاملات، خدا اور رسول کی شریعت کے مطابق کرنا چاہتے ہیں یا ان عائلی قوانین کے مطابق؟

یہ انہی اصول کی تشریح ہے جسے مودودی صاحب اس سے پہلے ان الفاظ میں بیان کر چکے ہیں۔

اسلامی اسٹیٹ بہرحال اس قانون پر قائم ہوگا جو خدا کی طرف سے اس کے نبیؐ نے دیا ہے۔ اور اس اسٹیٹ کو چلانے والی گورنمنٹ صرف اس حال میں اور اس حیثیت سے اطاعت کی مستحق ہوگی کہ وہ خدا کے قانون کو نافذ کرنے والی ہے۔

(اسلام کا نظریہ سیاسی)

اور "خدا کا قانون کیا ہے" اسے متعین کرنے کا حق جمہور کے منتخب کردہ نمائندوں کو نہیں ہوگا، بلکہ ان لوگوں کو ہوگا جو شریعت کا علم رکھتے ہوں (اسلام کا نظامِ حیات) کھلے الفاظ میں یوں کہیئے کہ اگر حکومت ایک قانون نافذ کرے اور یہ حضرات اس کے متعلق فتویٰ صادر کر دیں کہ وہ خلافِ شریعت ہے تو (مودودی صاحب کے فتویٰ کے مطابق) پابندِ شریعت مسلمانوں کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں ہوگا کہ وہ حکومت کے قانون کی خلاف ورزی کریں۔

اس نقشے کو سامنے رکھئے اور پھر سوچئے کہ ایک ایسے ملک میں جس کی اسی نوّے فی صد آبادی جہلا پر مشتمل ہو، اس قسم کی سول نافرمانی جسے از روئے شریعت واجب قرار دیدیا جائے، کیا رنگ لائے گی؟ اس کے بعد آپ خود ہی فیصلہ کیجئے کہ کیا یہ مسئلہ ایسا نہیں تھا جس پر اسمبلی کے ارکان، سب سے پہلے غور و خوض کرتے؟ لیکن، جیسا کہ ہم نے پہلے کہا ہے، انہیں، بدقسمتی سے اس خطرہ کا کوئی احساس نہیں ہوا۔ اس لئے انہوں نے اسے درخورِ اعتنا ہی نہیں سمجھا۔ بہرحال، اگر ان کی نگاہوں میں اس سوال کی اہمیت اس سے پہلے نہیں آئی تو انہیں اس پر اب ہی غور کرنا چاہیئے! لیکن اس سوال کو ارکانِ اسمبلی تک ہی کیوں محدود سمجھا جائے۔ جو خطرہ پورے کے پورے ملک کے امن کو اپنی لپیٹ میں لے لینے والا ہو، اس کا مداوا ساری کی ساری قوم کو تلاش کرنا چاہیئے اس لئے ہم ملک کے تمام سنجیدہ طبقہ سے درخواست کریں گے کہ وہ اپنی اولین فرصت میں اس مسئلہ پر غور کریں اس لئے کہ اگر (خدانخواستہ) یہ چنگاری کہیں ایک مرتبہ بھی بھڑک اٹھی، تو معلوم اس کا انجام کیا ہو؟

۵۔ مودودی صاحب نے ۱۹۳۷ء میں اپنی پارٹی کا سنگِ بنیاد رکھتے وقت، اس کا مقصد یہ بتایا تھا کہ

> یہ پارٹی اسلام کے اصولوں پر ایک نئے اجتماعی نظام اور ایک نئی تہذیب کی تعمیر کا پروگرام لے کر اٹھے اور عامۂ خلائق کے سامنے اپنے پروگرام کو پیش کر کے، زیادہ سے زیادہ سیاسی طاقت فراہم کرے اور بالآخر حکومت کی مشین پر قابض ہو جائے۔

وہ، زیادہ سے زیادہ طاقت فراہم کر کے، جس قسم کی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں، اس کے متعلق بھی انہوں نے بتا دیا تھا کہ

> اس نوعیت کا اسٹیٹ ظاہر ہے کہ اپنے عمل کے دائرے کو محدود نہیں کر سکتا۔ یہ ہمہ گیر اور کلی اسٹیٹ ہے۔ اس کا دائرۂ عمل پوری انسانی زندگی پر محیط ہے۔ یہ تمدن کے ہر شعبے کو اپنے مخصوص اخلاقی نظریہ اور اصلاحی پروگرام کے مطابق ڈھالنا چاہتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں کوئی شخص اپنے کسی معاملہ کو پرائیویٹ اور شخصی (PERSONAL) نہیں کہہ سکتا۔ اس لحاظ سے یہ اسٹیٹ فاشستی اور اشتراکی حکومتوں سے ایک گونہ مماثلت رکھتا ہے (اسلام کا نظریہ سیاسی)

اس سے ظاہر ہے کہ مودودی صاحب، بجز اس حکومت کے جسے ان کی اپنی پارٹی قائم کرے، کسی حکومت کو اسلامی تصور کرنے کے لئے تیار نہیں۔ نہ ہی اس حکومت کے نافذ کردہ قوانین کو اسلامی قوانین قرار دینے پر آمادہ۔ حکومت تو ایک طرف، اس باب میں انہوں نے باقی ارباب شریعت کے مقابلہ میں بھی اپنے آپ کو منفرد قرار دے رکھا ہے۔ ہمارے ارباب شریعت میں سے ایک گروہ کا عقیدہ یہ ہے کہ اسلامی قانون وہ ہے جو صحیح احادیث کے مطابق ہو۔ اور احادیث کو صحیح اور ضعیف قرار دینے کے لئے، ان کے ہاں مستقل معیار ہیں۔ بلکہ یوں کہئے کہ یہ بات ان کے ہاں طے شدہ ہے کہ صحیح احادیث کونسی ہیں۔ مودودی صاحب بھی اس کے قائل ہیں کہ اسلامی قانون وہ ہے جو احادیث کے مطابق ہو، لیکن ان کا دعویٰ ہے کہ صحیح حدیث وہ ہے جسے ان کی نگہ بصیرت صحیح قرار دے۔ وہ اس باب میں کسی اور معیار کے قائل نہیں۔

دوسرے گروہ کا عقیدہ ہے کہ اسلامی قوانین وہ ہیں جو فقہ حنفی کے مطابق ہوں۔ مودودی صاحب بھی ان سے متفق ہیں، لیکن وہ فقہ کا بھی وہی فیصلہ صحیح مانتے ہیں جو ان کے اجتہاد پر پورا اترے۔ چنانچہ فقہ حنفی کے متعدد مسائل سے اختلاف رکھتے ہیں۔

لہذا، مودودی صاحب کا مسلک اس باب میں واضح ہے۔ ملک میں کوئی قانون نافذ ہو، وہ اسے کبھی اسلامی قرار نہیں دیں گے جب تک وہ ان کے اپنے معیار پر پورا نہیں اترے گا، خواہ اس کی تائید میں

احادیث اور فقہ بھی کیوں نہ پیش کردی جائے، اور جس قانون کو وہ غیراسلامی قرار دیدیں گے، ان کی پارٹی کے لوگ یا دیگر متفقین مودودی صاحب کے فتویٰ کے مطابق، اس قانون کی خلاف ورزی کو، از روئے شریعت، اپنے اوپر واجب سمجھیں گے۔ انہی کی دیکھا دیکھی، عوام بھی مذہب کے نام پر ان کے ساتھ شامل ہو جائیں گے۔

مودودی صاحب سے نیچے اُتر کر، آپ عام حالات پر بھی غور کریں گے تو وہاں بھی یہی پوزیشن نظر آئے گی۔ ملک میں مختلف فرقے آباد ہیں، اور ان میں سے ہر ایک کے "اسلامی قوانین" یا ان قوانین کے مرتب کرنے کے اصول و معیار، الگ الگ ہیں۔ آپ ان اصولوں میں سے کسی اصول کے مطابق بھی قانون مرتب کریں، وہ دوسرے فرقوں کے نزدیک غیراسلامی ہوگا، اور (مودودی صاحب کے پیش کردہ اصول کے مطابق، ان کے لئے) اس کی خلاف ورزی "تقاضائے شریعت" ہوگی۔ اور چونکہ اسلام کا کوئی متعین تصور نہیں، اس لئے جس کا جب جی چاہے کسی قانون کو غیراسلامی قرار دے کر ایسی صورت پیدا کر سکتا ہے۔ اس سے ملک میں جو خلفشار پیدا ہوگا وہ ظاہر ہے۔

۶۔ یہ ہے اس مسئلہ کی اہمیت۔ سوال یہ ہے کہ اس مسئلہ کا حل کیا ہے اور ملک کس طرح اس ہولناک خطرہ سے بچ سکتا ہے؟ آپ جتنی بار جی چاہے اس مسئلہ پر غور کیجئے اور جس زاویہ نگاہ سے مناسب سمجھئے اس کی طرف دیکھئے، آپ کو اس مشکل در مشکل مسئلہ کا حل اس کے سوا کوئی اور نظر نہیں آئے گا جس کی طرف طلوعِ اسلام روزِ اول سے دعوت دیتا چلا آ رہا ہے۔ وہ حل یہ ہے کہ، بجائے اس کے کہ یہ کہا جائے کہ ملک میں کوئی ایسا قانون نہیں بنے گا جو "اسلام" کے خلاف ہو، متعین طور پر کسی کتاب کا نام لیجئے اور یہ کہئے کہ ملک میں کوئی قانون اس کتاب کے خلاف نہیں بنے گا۔ اس سے پہلے، آئین میں یہ کہا گیا تھا کہ ملک میں کوئی قانون ایسا نافذ نہیں ہوگا جو "قرآن اور سنت" کے خلاف ہو۔ اُس وقت بھی ہم نے یہی کہا تھا کہ "سنت" کا تصور ہر فرقہ کا الگ الگ ہے، اور کوئی ایسی کتاب موجود نہیں جس میں ایسی "سنت" درج ہو جو تمام فرقوں کے نزدیک متفق علیہ ہو[1]۔ اس لئے، اس معیار کے مطابق، کوئی ایسا ضابطہ قوانین مرتب نہیں ہو سکے گا جو تمام فرقوں کے نزدیک متفق طور پر "اسلامی" ہو۔ موجودہ آئین میں "قرآن و سنت" کی جگہ "اسلام" کا لفظ درج کیا گیا ہے۔ اس میں بھی وہی دشواری ہے جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔

---

[1] ایسی کتاب تو درکنار، یہ حضرات اس پر بھی متفق نہیں کہ "سنت" کہتے کسے ہیں؟ چنانچہ "سنت" کی جو تعریف مودودی صاحب کرتے ہیں، اہلحدیث حضرات کا فیصلہ ہے کہ وہ اس کے خلاف آخر تک جہاد کریں گے ۔۔۔ (ملاحظہ ہو "جماعت اسلامی کا نظریہ حدیث" (مولانا محمد اسماعیل صاحب۔ ناظم جمعیت اہلحدیث)۔

"سنت" کی طرح، اسلام کا تصور بھی ہر فرقہ کا الگ الگ ہے۔ جو چیز ایک کے نزدیک عین اسلام ہے وہ دوسروں کے نزدیک حرام قطعی ہے۔ اس معیار کے مطابق، آپ کسی ایک فرقہ کے لئے قوانین تو مرتب کر سکتے ہیں۔ ایسے قوانین کبھی مرتب نہیں ہو سکتے جو تمام فرقوں کے نزدیک اسلامی قرار پا سکیں۔ اس کا بین ثبوت یہ ہے کہ خود مودودی صاحب؛ جو اپنے آپ کو اسلامی قوانین کی سب سے بڑی اتھارٹی سمجھتے ہیں، زیادہ سے زیادہ یہی کہہ سکے ہیں کہ یہاں فقہ حنفی رائج کر دی جائے۔ فقہ حنفی، مسلمانوں کے ایک فرقہ کے نزدیک اسلامی قوانین کی حیثیت رکھتی ہے، تمام مسلمانوں کے نزدیک نہیں۔

اب سوال یہ سامنے آتا ہے کہ وہ کتاب کونسی ہے جو کسی ایک فرقہ کے نزدیک نہیں، بلکہ تمام مسلمانوں کے نزدیک، متفقہ طور پر "اسلامی" ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کا ایک اور صرف ایک جواب ہو سکتا ہے۔ اور وہ یہ کہ وہ کتاب، کتاب اللہ کے علاوہ کوئی اور نہیں۔ فقہ کی کتابیں ہر فرقہ کی الگ الگ ہیں۔ سنت کی کتابیں ہر گروہ کی جداگانہ ہیں۔ لیکن یہ خصوصیت صرف قرآن کریم کو حاصل ہے کہ وہ مسلمانوں کے تمام فرقوں کے نزدیک مسلّمہ اور متفقہ طور پر کتاب اللہ ہے۔ یہی وہ متعین قدرِ مشترک ہے جس پر تمام مسلمانوں کا ایمان ہے۔ اسی کی بنیادوں پر وہ قوانین مرتب ہو سکتے ہیں جو تمام مسلمانوں کے نزدیک اسلامی قرار پا سکیں۔ اسے قانون کی بنیاد قرار دیجئے۔ اسمبلی میں جو مسودہ قانون پیش ہو، محرک سے کہیئے کہ وہ اس کی تائید میں قرآنی آیات پیش کرے۔ جو اس کی مخالفت کرے، اس سے کہیئے کہ وہ بھی اپنے نظریہ کی تائید میں قرآنی ارشادات پیش کرے۔ مشاورتی کونسل سے استصواب رائے کیجئے تو اس سے بھی کہیئے کہ وہ بتائے کہ قرآن اس باب میں کیا کہتا ہے۔ اور اگر معاملہ عدالت تک پہنچے تو اسے بھی اس بات کا مکلف ٹھیرائیے کہ وہ اپنے فیصلہ کا مدار قرآن پر رکھے۔ ابتداً "عبادات" کو اس سے الگ رکھئے اور اس اصول کا اطلاق صرف معاملات پر کیجئے۔ جب اس طرح معاملاتی قوانین میں یکسانیت پیدا ہو جائے گی تو آپ دیکھیں گے کہ اُمّت، عبادات کو بھی اس کے دائرے کے اندر لے آئے گی۔ اُمّت، صدیوں سے وحدت کی لذت سے ناآشنا ہے۔ اگر یہ زندگی کے ایک گوشے میں بھی اس سے کیف یاب ہو گئی تو اس کی کشش، دوسرے گوشوں کو بھی اپنی طرف لے آئے گی۔ قرآن میں اس کی صلاحیت آج بھی موجود ہے کہ وہ اختلافات مٹا کر، وحدت پیدا کر دے۔ اسے اس کا موقعہ تو دیجئے!

یاد رکھئے۔ ہم نہ احادیث کے منکر ہیں، اور نہ ہی جو کچھ ہمارے فقہی لٹریچر میں ہے، ہمیں اس کی افادیت سے انکار ہے۔ لیکن جس مقام پر اُمّت اس وقت پہنچ چکی ہے اس میں، ایک اسلامی مملکت میں تمام مسلمانوں کے لئے متفق علیہ قانون بنانے کے لئے، اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ اس کتاب کو قانون کی

بنیاد قرار دیا جائے جو تمام مسلمانوں کے نزدیک قدر مشترک ہے۔ اسے بنیاد قرار دیجئے اور اس کی روشنی میں احادیث اور فقہ سے فائدہ اٹھایئے۔ یوں قوانین مرتب کیجئے اور اختلاف کی صورت میں عدالت عالیہ کی طرف رجوع کیجئے۔ یہ ہے ہماری بصیرت کے مطابق اس مسئلہ کا حل۔

۷۔ کہا یہ جاتا ہے کہ خود قرآن کریم سے بھی کسی متفق علیہ فیصلہ پر نہیں پہنچا جا سکتا کیونکہ اس کی تعبیرات میں اختلاف ہے۔ اس ضمن میں سب سے پہلے اسے پیش نظر رکھئے کہ مقدم سوال متن (TEXT) کا ہے۔ تعبیرات کا سوال بعد میں پیدا ہوتا ہے۔ قرآن کا متن سب کے نزدیک متفق علیہ ہے اور اس کے علاوہ کسی اور کتاب کی یہ پوزیشن نہیں۔ اب ظاہر ہے کہ جس کتاب کا متن متفق علیہ ہو اور اس کا دعویٰ یہ ہو کہ میرے اندر کوئی اختلافی بات نہیں، بلکہ میں دنیا کے اختلافات مٹانے کے لئے آئی ہوں، تو اس کی تعبیرات میں اختلاف ہماری کسی غلطی کی وجہ سے ہوگا۔ یہ اس کتاب کا داخلی نقص نہیں ہوگا۔ اس غلطی کو رفع کر دیا جائے تو تعبیرات کا اختلاف خود بخود دور ہو جائے گا۔ تعبیرات کے اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ ہر فرقہ اپنے اپنے معتقدات اور مسلک کو اوپر رکھتا ہے اور ان کے تابع قرآن کا مفہوم متعین کرتا ہے۔ عام عقیدہ یہ ہے کہ قرآن کی وہی تفسیر و تعبیر درست ہے جو احادیث میں آئی ہے۔ اور احادیث ہر فرقہ کی الگ الگ ہیں اس لئے ہر فرقہ کی قرآن کی تعبیر بھی الگ الگ ہے۔ پھر یہ بھی عقیدہ ہے کہ حدیث، قرآن کو منسوخ کر سکتی ہے۔ دوسری طرف اہل فقہ کا عقیدہ ہے کہ قرآن کی جو آیت ان کے کسی امام کے قول سے ٹکرائے، یا تو اس آیت کی ایسی تاویل کی جائے جس سے وہ اس قول کے مطابق ہو جائے۔ اور اگر ایسا ممکن نہ ہو تو اس آیت کو منسوخ سمجھا جائے۔ آپ سوچئے کہ ان حالات میں قرآن کی تعبیرات میں اختلاف نہیں ہوگا تو اور کیا ہوگا؟ قرآن کو سب سے اوپر رکھئے اور ہر خارج از قرآن چیز کو اس کے تابع۔ پھر دیکھئے کہ قرآن کریم کا یہ دعوےٰ کس قدر حقیقت بن کر سامنے آجاتا ہے کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں۔[1]

۸۔ لیکن اگر اس کے باوجود کسی کو اس پر اصرار ہے کہ قرآن کی رُو سے بھی مسلمانوں کے لئے متفق علیہ ضابطہ قوانین مرتب نہیں ہو سکتا تو پھر اسلامی مملکت اور اسلامی قوانین کا خیال چھوڑیئے۔ اس لئے کہ کسی مملکت کے لئے

---

[1] جو حضرات اس مسئلہ میں زیادہ دلچسپی رکھتے ہوں اور مزید وضاحت چاہتے ہوں وہ ادارہ کی طرف سے شائع کردہ کتاب

(THE PRINCIPLES OF LAW-MAKING IN ISLAM)

کا مطالعہ فرمائیں۔

قیام کیلئے بنیادی شرط یہ ہے کہ ملک میں ایک ہی قانون رائج ہو۔ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ پرسنل لاز ہر فرقہ کے لئے الگ الگ ہوں، اور پبلک لاز سب کے لئے یکساں[1]۔ لیکن وہ دشواری اس صورت میں بھی، اپنی جگہ برستور رہے گی۔ یعنی جب فقہ، احادیث اور قرآن، تینوں میں سے کسی کی رُو سے بھی متفق علیہ قانون نہیں بن سکتا، تو آپ ایسے پبلک لاز کس طرح بنا سکیں گے جنہیں تمام فرقے یکساں طور پر اسلامی تسلیم کر لیں؟ یہ لاز بھی بہر حال، کسی ایک فرقہ کی فقہ، احادیث یا قرآن کی تعبیر کے مطابق ہی بنیں گے۔ اور ظاہر ہے کہ دوسرے فرقے ان قوانین کو "خدا اور رسول" کے احکام ماننے کے لئے تیار نہیں ہوں گے۔ اس سے پھر وہی خلفشار پیدا ہو جائے گا جس سے بچنے کے لئے آپ یہ شکل اختیار کرنا چاہتے ہیں۔

۹ — یہ ہے ہمارے نزدیک حالات کا تجزیہ اور وہ خطرہ جس کے پیدا ہونے کا ہر وقت امکان ہے ہم ہر اس پاکستانی سے، جس کے دل میں ملک و ملّت کا کچھ بھی درد ہے، پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا یہ اشد ضروری نہیں کہ، قبل اس کے کہ ملک میں ایسے ناخوشگوار حالات پیدا ہوں، اس مشکل مسئلہ کا کوئی حل سوچ لیا جائے تاکہ ملک کا امن خطرہ میں نہ پڑے۔ اس سلسلہ میں ہم اربابِ نظم و نسق سے گزارش کریں گے کہ وہ خود اس مقصد کے لئے اقدام کریں۔ ہمارا مشورہ یہ ہے کہ ملک کے سنجیدہ اہلِ فکر طبقہ کے نمائندوں کو ایک جگہ اکٹھا کیا جائے اور اس مسئلہ کے تمام گوشوں کو ان کے سامنے رکھ کر، ان سے کہا جائے کہ اس کا مناسب حل سوچیں۔ ہمیں امید ہے کہ اگر یہ حضرات، ٹھنڈے دل سے، مخلصانہ طور پر، اس اہم اور نازک مسئلہ پر غور کریں گے تو اس کا کوئی نہ کوئی حل ضرور نکل آئے گا جس سے ملک میں اسلامی قوانین بھی نافذ ہوں اور وہ خلفشار بھی پیدا نہ ہو جس کا ہولناک تصور ان گزارشات کا جذبہ محرکہ ہے۔

یا اگر اُن کے، یا کسی اور صاحبِ فکر کے ذہن میں، اس سے زیادہ موزوں کوئی اور شکل ہو، تو اسے اختیار کر لیا جائے۔ لیکن اس مسئلہ کو معمولی سمجھ کر نظر انداز ہرگز نہ کیا جائے۔ اس کے عواقب بڑے خطرناک ہو سکتے ہیں۔ خدا ہمیں ان سے محفوظ رکھے۔ وَاللّٰہُ خَیْرٌ الْحَافِظِیْنَ۔

کاپیاں پریس میں جا رہی تھیں کہ (پاکستان ٹائمز بابت ۳ جولائی میں) اسلامی مشاورتی کونسل کے چھ ارکان کے اسمائے گرامی شائع ہوئے ہیں، جنہیں اخباری اطلاع کے مطابق، منتخب کیا جا رہا ہے۔

---

[1] پرسنل اور پبلک لاز کی تفریق خود قرآنی ہے اور سیکولر تصورِ حکومت کی پیدا کردہ۔

جسٹس شیخ شریف صاحب۔ جسٹس ایس۔ اے۔ رحمٰن صاحب۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی صاحب۔ پیر صاحب دیول شریف۔ مولانا اکرم خان صاحب۔ اور حافظ کفایت حسین صاحب (ان کے علاوہ ڈھاکہ یونیورسٹی اور کراچی یونیورسٹی کے دو پروفیسر صاحبان کے انتخاب کا بھی امکان بتایا گیا ہے)۔ کونسل میں ابھی چھ ارکان اور مقرر کئے جاسکتے ہیں (اگرچہ ان کا مقرر کیا جانا ضروری نہیں)۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ مزید ممبر مقرر کئے جائیں گے تو وہ کس قسم کے ہوں گے۔ لیکن جہاں تک (اس تجربہ کے مطابق) موجودہ ارکان کا تعلق ہے، ان سے کم از کم وہ خطرہ متوقع نہیں جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے۔ یعنی یہ کہ اگر اسمبلی نے کونسل کے کسی مشورہ کو تسلیم کیا اور اس کے خلاف قانون مرتب کرا دیا، تو ملک میں طوفان اٹھا دیا جائے گا کہ یہ قانون غیر اسلامی ہے اور اسکی خلاف ورزی، از روئے شریعت، واجب۔ یہ کونسل ہنگامے برپا نہیں کرائے گی۔ (باقی ممبر اگر مقرر کئے گئے تو ان کے متعلق کچھ کہنا قبل از وقت ہے)

لیکن، اس کے باوجود، کونسل سے باہر، مذہبی طبقہ کی طرف سے جس خطرہ کے متعلق ہم نے گذشتہ صفحات میں عرض کیا ہے، اس کا امکان بہرحال موجود ہے، اور اس کا حل سوچنے کی اشد ضرورت ہے۔ ہم اسے پھر دہرا دینا چاہتے ہیں کہ جب تک متعین طور پر نہیں کہا جائے گا کہ ملک کا کوئی قانون اس کے خلاف نہیں ہوگا، اس وقت تک نہ اسلامی مشاورتی کونسل کوئی مفید مشورہ دے سکے گی۔ نہ اسمبلی اطمینان بخش قانون مرتب کر سکے گی، اور نہ ہی اس خطرہ کا امکان ختم ہوگا جسے، موجودہ صورت میں، ہر وقت پیدا کیا جاسکتا ہے۔ یہی وہ اصل سوال ہے جس پر غور و فکر کی طرف ہم نے، گزشتہ صفحات میں دعوت دی ہے۔

واللہ المستعان علیہ توکلت والیہ انیب۔

طلوع اسلام کے لئے دہلوی طرز نگارش کے ماہر (عربی اردو یکساں)

کتابی کاتب کی ضرورت ہے

ضرورت مند حضرات نمونہ ساتھ لائیں۔ اور اس پتہ پر ملیں۔

۲۵/بی ۔ گل برگ کالونی ۔ لاہور

عائلی قوانین

قرآن کریم کی روشنی میں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عائلی قوانین

(قرآن کریم کی روشنی میں)

۱۔ نکاح

قرآن کریم کی رُو سے، ایک مرد اور عورت کا ان تمام ذمہ داریوں اور حقوق کو لئے ہوئے جو اللہ تعالیٰ نے اس باب میں متعین کئے ہیں، میاں بیوی کی حیثیت سے زندگی بسر کرنے کا معاہدہ "نکاح" کہلاتا ہے۔ قرآن کریم نے اسے مِّيثَاقًا غَلِيظًا (۴/۲۱) — "پختہ عہد" سے تعبیر کیا ہے۔

اس معاہدہ کی شرائط

معاہدہ کوئی بھی ہو، اس کے لئے ضروری ہے کہ فریقین بالغ ہوں اور وہ معاہدہ، ان کی باہمی رضامندی سے، بلا کسی قسم کے جبر و اکراہ کے ہو۔ قرآن کریم نے معاہدۂ نکاح کے لئے، ان دونوں شرطوں کو ضروری قرار دیا ہے۔ اس نے بلوغت کے لئے نکاح کی عمر کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ سورۂ نساء میں ہے۔

بلوغت وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰٓى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ ۚ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْٓا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ ۔۔۔۔۔۔ (۴/۶)۔

(تم جب یتیموں کے سرپرست بنو تو) انہیں پرکھتے رہو تاآنکہ وہ نکاح کی عمر کو پہنچ جائیں۔ پھر اگر تم ان میں عقل کی پختگی پاؤ تو ان کے مال و متاع ان کے حوالے کر دو۔

یہاں کہا گیا ہے کہ جب یتیم "نکاح کی عمر" کو پہنچ جائیں تو ان کے مال ان کے حوالے کر دو۔ اور سورۂ انعام میں ہے حَتّٰی یَبْلُغَ اَشُدَّهٗ (۶/۱۵۲)۔ جب وہ "جوانی کی عمر" تک پہنچ جائیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ قرآن کریم کے مطابق "نکاح کی عمر" جوانی ہے۔ جب تک لڑکا اور لڑکی جوان نہ ہو جائیں، وہ نکاح کی عمر کو نہیں پہنچتے۔ لہذا قرآن کی رو سے نابالغ کی شادی ہو ہی نہیں سکتی کیونکہ وہ نکاح کی عمر کو نہیں پہنچا۔

یہ جو عام طور پر کہا جاتا ہے کہ نکاح کے وقت حضرت عائشہؓ کی عمر چھ سال کی تھی، تو یہ بالکل غلط ہے۔ نکاح کے وقت ان کی عمر سترہ اور انیس برس کے درمیان تھی۔

(ب) نکاح کے لئے باہمی رضامندی ضروری ہے۔ چنانچہ مردوں کے متعلق ہے۔ فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ (۴/۳)۔ تم ایسی عورتوں سے شادی کرو جو تمہیں پسند ہوں۔ اور عورتوں کے متعلق کہا کہ لَا یَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا (۴/۱۹)۔ تمہارے لئے قطعاً جائز نہیں کہ تم عورتوں کے زبردستی مالک بن جاؤ۔

لہذا، جس نکاح میں مرد اور عورت دونوں کی رضامندی شامل نہیں، وہ نکاح، قرآن کی رو سے نکاح ہی نہیں کہلا سکتا۔

چونکہ کم سنی میں نکاح ہو ہی نہیں سکتا۔ اس لئے نکاح کے لئے ولی (سرپرست) کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بالغ لڑکی کا کوئی ولی نہیں ہوتا۔ وہ اپنے معاملات کی خود مختار ہوتی ہے۔

۲۔ نکاح سے مقصد

(۱) نکاح سے مقصد محض جنسی جذبہ کی تسکین نہیں بلکہ ان تمام ذمہ داریوں کا پورا کرنا ہے جو نکاح سے عائد ہوتی ہیں۔ اگر کوئی شخص محض جنسی جذبہ کی تسکین کے لئے "نکاح" کرتا ہے، اور ان ذمہ داریوں کی پرواہ نہیں کرتا جو نکاح کی رو سے عائد ہوتی ہیں، تو قرآن کریم کی رو سے وہ حقیقی معنوں میں نکاح نہیں ہوتا۔ اس نے اس کی وضاحت مُحْصِنِیْنَ غَیْرَ مُسٰفِحِیْنَ (۴/۲۴) کہہ کر دی ہے۔ "مُحْصِنِیْنَ" کے معنی ہیں، حدود و قیود کے اندر رہنے کے لئے۔ اور مُسٰفِحِیْنَ سے مراد ہے محض جنسی جذبہ کی تسکین کے لئے۔

حقوق و فرائض

(ب) نکاح سے، مرد اور عورت دونوں پر یکساں حقوق اور یکساں فرائض عائد ہوتے ہیں۔ سورۂ بقرہ میں ہے۔ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ (۲/۲۲۸)

---

[1] اس آیت میں جو ہے وَلِلرِّجَالِ عَلَیْهِنَّ دَرَجَةٌ۔ تو اس کا مفہوم "طلاق اور علیحدگی" کے عنوان میں بیان کیا جائے گا۔

قاعدے اور قانون کے مطابق، عورت کے حقوق بھی اتنے ہی ہیں جتنی اس کی ذمہ داریاں ہیں۔

(ج) میاں بیوی کے تعلقات ایسے خوشگوار ہونے چاہئیں کہ اس سے گھر میں کامل سکون اور اطمینان پیدا ہو۔ قرآن کریم کی رو سے "ازواج" (جوڑوں) کا مطلب ہی یہ ہے لِتَسْكُنُوٓا اِلَيْهَا (۳۰/۲۱)۔ ان سے تسکین حاصل ہو اور باہمی محبت اور رفاقت پیدا ہو۔ وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّ رَحْمَةً (۳۰/۲۱)۔ ایسے گھر کو خدا جنت سے تعبیر کرتا ہے (۲/۳۵)۔ اس کے برعکس، جس میاں بیوی میں ہم آہنگی خیالات نہ ہو، ان کے گھر کو وہ "جہنم" کہہ کر پکارتا ہے (۲/۳۵)۔

مروجہ قانون ہمارے ہاں کے مروجہ عائلی قوانین کی رو سے، نابالغ لڑکی یا لڑکے کے نکاح کو غیر قانونی قرار دیا گیا ہے اور یہ بالکل قرآن کی منشاء کے مطابق ہے۔ اگر اس پابندی کو منسوخ کیا گیا تو یہ قرآن کے حکم کی کھلی ہوئی مخالفت ہوگی۔

(ج) رجسٹریشن

چونکہ نکاح ایک معاہدہ ہے اس لئے اسے ضبط تحریر میں لے آنا اور سرکاری ریکارڈ میں درج کرا دینا بہتر ہے۔ اس سے مستقبل میں پیدا ہونے والے بہت سے جھگڑے مٹ جاتے ہیں۔ قرآن کریم نے تو باہمی لین دین کے معاملات کو تحریر میں لانے کی سخت تاکید کی ہے (۲/۲۸۲)۔ نکاح کا معاہدہ اس سے بھی زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔

مروجہ عائلی قوانین میں، اس معاہدہ کو سرکاری رجسٹر میں درج کرانے کی تاکید کی گئی ہے۔

۲- مہر

چونکہ ازدواجی میزان میں، عورت کا پلڑہ، بمقابلہ مرد کے، جھکتا ہے (یعنی عورت کی قدر و قیمت مرد کے مقابلہ میں زیادہ ہے) اس لئے، مرد کے لئے ضروری قرار دیا گیا ہے کہ وہ کچھ تحفہ عورت کو دے۔ اسے مہر کہا جاتا ہے۔ یہ مہر کسی بات کا معاوضہ نہیں ہوتا۔ بلکہ کسی قسم کے معاوضہ کے خیال کے بغیر بطور تحفہ دیا جاتا ہے۔ اس کے لئے قرآن نے نِحْلَةً کا لفظ استعمال کیا ہے (۴/۴)، جس کے معنی ہیں "بلا بدل"۔

(ب) قرآن نے مہر کی کوئی مقدار مقرر نہیں کی۔ جو کچھ بھی باہمی رضامندی سے طے ہو جائے وہ مہر ہے۔ لیکن چونکہ اس کا ادا کرنا ضروری ہے، اس لئے اسے علیٰ قدر وسعت ہونا چاہیئے (دیکھئے ۲/۲۳۶، ۲/۲۴)۔

(ج) ہر عورت کی ملکیت ہوتا ہے اور کسی کو حق نہیں کہ اُسے اس سے محروم کر دے۔ البتہ عورت اپنی رضامندی سے اس میں سے کچھ چھوڑ بھی سکتی ہے۔ (۴/۴)

(د) اگر کسی وجہ سے مہر مقرر نہ کیا گیا ہو تو اُسے مرد کی وسعت کے مطابق طے کر لینا چاہیئے (۲/۲۳۶)

مروجہ قانون مروجہ عائلی قوانین میں یہ کہا گیا ہے کہ اگر شادی کے معاہدہ میں مہر کی ادائیگی کے طریق کار کے متعلق کوئی تفصیل موجود نہ ہو تو مہر کی کل رقم کے متعلق یہ تصور کیا جائے گا کہ وہ عند الطلب واجب الادا ہے۔ یہ قرآن کی منشاء کے مطابق ہے۔

۳۔ طلاق

طلاق کے معنی ہیں "نکاح کے معاہدہ سے آزاد ہو جانا"۔ چونکہ یہ معاہدہ فریقین (مرد اور عورت) نے باہمی رضامندی سے استوار کیا تھا اس لئے ان میں سے کسی ایک کو اس کا حق نہیں پہنچ سکتا کہ وہ جب بھی چاہے، اپنی مرضی سے، اس معاہدہ کو منسوخ کر دے۔ اس میں دوسرے فریق کے حقوق کا تحفظ ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے اسے انفرادی فیصلہ پر نہیں چھوڑا بلکہ معاشرہ کو حکم دیا ہے کہ وہ اس معاملہ کو اپنے ہاتھ میں لے۔ (معاشرہ سے مراد وہ نظام ہے جو متنازعہ فیہ معاملات میں فیصلہ کرنے کے لئے قائم ہو۔ اسے عدالت کہا جائے گا)۔ چنانچہ اس باب میں، سورۃ النساء میں ہے۔

> اگر تم کسی میاں بیوی میں باہمی اختلاف۔ جھگڑے یا مخالفت (شقاق) کا خدشہ محسوس کرو، تو ایک ثالثی بورڈ بٹھاؤ، جس میں ایک ممبر مرد کے خاندان کا اور ایک عورت کے خاندان کا ہو۔ اس بورڈ کی کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ وہ ان دونوں میں مصالحت کرائے۔ اگر انہوں نے ایسا کیا تو امید کی جا سکتی ہے کہ میاں بیوی میں مفاہمت کی صورت پیدا ہو جائے گی (۴/۳۵)

(۲) اگر ثالثوں کی کوشش سے ان میں موافقت کی صورت نکل آئے تو ہو المراد۔ لیکن اگر وہ اپنی کوشش میں ناکام رہیں تو ظاہر ہے کہ انہیں اس معاملہ کی رپورٹ اس عدالت کے پاس بھیجنی ہو گی جس نے انہیں ثالث مقرر کیا تھا۔ وہ عدالت فیصلہ کرے گی کہ فریقین میں طلاق ہو جانی چاہیئے۔ اور اس کی شرائط کیا ہوں گی۔ عدالت کے اس فیصلہ کا نام طلاق ہو گا۔

ہمارا مروجہ قانون طلاق کے بارے میں ہمارے مروجہ عائلی قوانین میں دو ایک بنیادی نقص ہیں۔

جن کا دور کیا جانا ضروری ہے۔

(۱) اس میں کہا گیا ہے کہ جو شخص اپنی بیوی کو طلاق دینا چاہے وہ طلاق کا اعلان کرنے کے فوری بعد، اس امر کی اطلاع (نوٹس) یونین کے چیرمین کو دے۔

(۲) چیرمین، ایک ثالثی کونسل مقرر کرے گا تاکہ فریقین میں مصالحت کرائی جائے۔

اگر مصالحت نہ ہو سکے تو، نوٹس کی تاریخ سے نوے دن کے بعد، طلاق مؤثر ہو جائے گی۔

یعنی معاہدۂ نکاح منسوخ تصور ہوگا۔

شق (۱) میں نقص یہ ہے کہ

(ا) اس میں مرد کو حق دیا گیا ہے کہ وہ جب جی چاہے، طلاق کا اعلان کر دے۔ یہ چیز قرآن کے حکم کے خلاف ہے۔ اس شق کو یوں تبدیل کر دینا چاہیئے کہ

جو شخص اپنی بیوی کو طلاق دینے کا ارادہ کرے، اسے چاہیئے کہ اپنے اس ارادہ کی اطلاع چیرمین کو دے

اس صورت میں مصالحت کے کچھ معنی بھی ہوں گے۔ ورنہ، طلاق کا اعلان کر دینے کے بعد، ثالثی بورڈ کا تقرر اور مصالحت کی کوشش، بے معنی چیز ہے۔

(ب) دوسرا بنیادی نقص یہ ہے کہ اس میں طلاق کے اعلان کا حق مرد کو دیا گیا ہے، عورت کو نہیں۔ عورت کے متعلق کہا گیا ہے کہ

اگر طلاق کا حق باضابطہ طور پر بیوی کو دیا گیا ہو تو (وہ طلاق کا اعلان کر کے ثالثی کونسل کی طرف رجوع کر سکتی ہے)۔

"بیوی کو طلاق کا حق باضابطہ طور پر دینے" کا مطلب کچھ نہیں۔ معاہدۂ نکاح کی رُو سے، میاں اور بیوی دونوں کو یکساں حقوق حاصل ہوتے ہیں۔ اس لئے جن حالات میں، مرد، طلاق حاصل کرنے کا حق رکھتا ہے، انہی حالات میں عورت بھی ویسا ہی حق رکھتی ہے۔ یہ بات تو بڑی تعجب انگیز سی ہوگی کہ معاہدہ تو فریقین کی رضامندی سے ہو اور اسے فسخ کرنے یا کرانے کا حق صرف ایک فریق کو حاصل ہو۔ دوسرے کو حاصل نہ ہو!

مروجہ قانون کی رُو سے، اگر بیوی کو "باضابطہ طلاق کا حق" نہ دیا گیا ہو، تو اسے تنسیخ نکاح کے لئے عدالت میں مقدمہ دائر کرنا پڑتا ہے۔ میاں اور بیوی کے لئے، الگ الگ قوانین، قرآن کے منشاء کے خلاف ہے۔

ہٰذا اس شق کا اطلاق میاں اور بیوی دونوں پر یکساں ہونا چاہیئے۔ یہ ترمیم نہایت ضروری ہے۔ اس کے بغیر مرد کو یہ حق ہر وقت رہتا ہے کہ وہ جب جی چاہے طلاق کا اعلان کر دے۔ اس کے بعد ثالثی کونسل میں جا کر کہہ دے کہ میں مصالحت کرنے پر تیار نہیں۔ ثالثی کونسل اس میں کچھ نہیں کر سکے گی۔ مرد طلاق دے چکا۔ وہ طلاق مؤثر ہو گی۔ یہ وہی ظلم ہے جو مردوں کے ہاتھوں عورتوں پر ہوتا چلا آ رہا ہے۔ اس قانون نے اس ظلم میں کسی قسم کی کمی یا اصلاح نہیں کی۔ لہٰذا، اس شق کی صورت یوں ہونی چاہیئے کہ

میاں یا بیوی میں سے جو کوئی، معاہدۂ نکاح کو فسخ کرنے کا ارادہ کرے، اُسے چاہیئے کہ اس امر کی اطلاع چیرمین کو دے ....

شق (۴)

میں کہا گیا ہے کہ اگر مصالحت نہ ہو سکے تو نوٹس کی تاریخ کے نوّے دن بعد، طلاق مؤثر سمجھی جائے گی۔ (نوّے دن بطور عدت رکھے گئے ہیں)۔

قرآن کی رُو سے

(ا) طلاق اُس دن ہو گی جب عدالت فیصلہ کرے کہ فریقین کا معاہدۂ نکاح فسخ کیا جاتا ہے۔ عدت بھی اسی وقت سے شروع ہو گی۔

(ب) عدت کی مدت، مختلف حالات میں مختلف ہے۔ قرآن کریم میں یہ تفصیلی طور پر مذکور ہے۔ وہی مدت ہمارے قانون میں درج ہونی چاہیئے۔ موجودہ شق ناقص ہے۔

نوٹ:۔ ان تمام معاملات میں، عائلی قوانین کی رو سے، یونین کونسل اور اس کے چیرمین کو مجاز قرار دیا گیا ہے۔ ہماری رائے میں اس کی جگہ کسی باقاعدہ عدالت کو یہ اختیارات حاصل ہونے چاہئیں۔

۴۔ طلاق کے بعد

عدالت کے فیصلے سے نکاح منسوخ ہو گیا۔ اس کے بعد، عدت کے دوران میں، یہ عورت کسی دوسرے مرد سے نکاح نہیں کر سکتی۔ البتہ اگر طلاق مرد نے حاصل کی تھی، عورت فسخ نکاح نہیں چاہتی تھی۔ تو یہ مرد اگر چاہے تو، عدت کے دوران میں اس عورت سے نکاح کر سکتا ہے۔ (سورۂ بقرہ۔ آیت نمبر ۲۲۸)

(ب) جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، عدت کے دوران میں یہ عورت کسی دوسرے مرد سے شادی نہیں کر سکتی

لیکن مرد پر اس کی کوئی پابندی نہیں۔ وہ جب ون چاہے، کسی دوسری عورت سے شادی کر سکتا ہے، بس یہ ایک "زائد حق" ہے جو عورت کے مقابلہ میں مرد کو حاصل ہے۔ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ (۲/۲۲۸) میں اسی زائد حق (فضیلت) کی طرف اشارہ ہے۔

(ج) اگر عدت کے دوران میں یہ سابقہ میاں بیوی آپس میں نکاح نہ کریں تو عدت کی مدت ختم ہونے پر انہیں اس امر کی اطلاع عدالت مذکور کو دینی ہوگی (ملاحظہ ہو آیت ۶۵)

(د) اگر یہ سابقہ میاں بیوی چاہیں تو عدت کی مدت کے بعد بھی آپس میں شادی کر سکتے ہیں۔ (یہ شادی طلاقِ اوّل کے بعد کی شادی کہلائے گی)۔ اگر انہوں نے (عدت کے دوران میں یا اس کے بعد) آپس میں شادی کر لی لیکن اس کے بعد پھر مذکورہ بالا طریقہ کے مطابق، ان میں طلاق ہو گئی، تو دوسری مرتبہ بھی یہ میاں بیوی، عدت کے دوران میں یا عدت کے بعد، آپس میں شادی کر سکتے ہیں۔ (یہ دوسری مرتبہ کی طلاق کے بعد کی شادی ہوگی)۔

لیکن اگر ان میں پھر طلاق کی نوبت آجائے (یعنی تیسری مرتبہ طلاق ہو جائے) تو پھر یہ میاں بیوی آپس میں شادی نہیں کر سکتے، نہ عدت کے دوران میں، نہ اس کے بعد، قرآن میں ہے۔ اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۪ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ ۭ (۲/۲۲۹)۔ طلاق دو مرتبہ کی ایسی ہے جس کے بعد تم، قاعدے کے مطابق، عورت کو (نکاح میں) روک سکتے ہو یا حسن کارانہ انداز سے رخصت کر سکتے ہو۔ لیکن تیسری مرتبہ کی طلاق کے بعد تم آپس میں نکاح نہیں کر سکتے۔ یہ مطلب ہے تین طلاق کا۔

عائلی قانون

میں یہ شق قرآن کریم کی منشا کے مطابق ہے۔ البتہ اس میں ذیل کے اضافے کی ضرورت ہے یعنی

(د) اگر اس عورت کو نئے خاوند سے طلاق مل جائے۔ یا وہ فوت ہو جائے، تو پھر یہ عورت، اگر چاہے تو اپنے سابقہ خاوند سے شادی کر سکتی ہے۔ (۲/۲۳۰)۔

۵۔ تعدّدِ ازدواج (ایک سے زیادہ بیویوں سے نکاح)

ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ قرآن کریم کی رُو سے نکاح سے مقصد یہ ہے کہ انسان امن و سکون کی زندگی

بسر کر سکے۔ میاں بیوی میں باہمی محبت اور رفاقت کا تعلق ہو جس سے گھر "جنت" بن جائے۔ اس مقصد کے پیشِ نظر اس نے تاکید کی ہے کہ بیوی (یا میاں) کے انتخاب میں، خیالات اور نظریات کی موافقت کا خیال رکھا جائے۔ نکاح، فریقین کی رضامندی سے، بغیر کسی قسم کے جبر و اکراہ کے ہو۔ اس قدر احتیاط کے باوجود، اگر تجربہ بتائے کہ انتخاب صحیح نہیں تھا اور اس رشتے کا نباہ مشکل ہے، تو نکاح کا معاہدہ فسخ کر لیا جائے، اور کسی دوسری عورت (یا مرد) سے شادی کر لی جائے۔ سورۂ نساء میں ہے وَاِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ "..... (یعنی) اگر تم ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی سے نکاح کرنا چاہو (تو اس طریق کے مطابق جس کا ذکر طلاق کے عنوان میں کیا جا چکا ہے) پہلی بیوی کا مہر پورا پورا ادا کر کے، معاہدۂ نکاح فسخ کر لو، اور پھر دوسری عورت سے شادی کرو۔ اس سے واضح ہے کہ قرآن کریم کی رُو سے، شادی کا اصول "ایک وقت میں ایک بیوی" (MONOGAMY) ہے۔

ہنگامی حالات (۲) لیکن قرآن کریم اسے بھی تسلیم کرتا ہے کہ بعض اوقات ایسے ہنگامی حالات پیدا ہو سکتے ہیں جن کے پیشِ نظر اس اصولی قانون میں، استثناء کی ضرورت لاحق ہو جائے۔ اس قسم کے حالات، اسلام کے ابتدائی دور میں، مدینہ کی زندگی میں پیدا ہو گئے تھے۔ اُس وقت کیفیت یہ تھی کہ

(۱) مسلمانوں کی ایک محدود سی جماعت تھی (جنگ بدر میں، جو ۲ھ میں ہوئی تھی، مسلمان مجاہدین کی تعداد صرف ۳۱۳ تھی)۔

(۲) مسلسل لڑائیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا جو رسول اللہؐ کی پوری مدنی زندگی میں جاری رہا۔

(۳) ان لڑائیوں کی وجہ سے، اس مختصر سی جماعت میں، نوجوان افراد کی کمی ہوتی چلی گئی اور بیوائیں اور یتیم بچے دن بدن زیادہ ہوتے گئے۔ ان کے علاوہ، مسلمان عورتیں، مکہ میں اپنے غیر مسلم خاوندوں کو چھوڑ کر، مدینہ کی طرف آنا شروع ہو گئیں۔

(۴) مسلمان عورتیں، صرف مسلمان مردوں سے شادی کر سکتی تھیں۔ کسی غیر مسلم سے نہیں کر سکتی تھیں۔ حتیٰ کہ اہلِ کتاب (یہود و نصاریٰ) سے بھی نہیں۔

(۵) لہٰذا، اس وقت صورت یہ پیدا ہو گئی کہ بیواؤں کی۔ اور شادی کے قابل لڑکیوں کی تعداد، مردوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہو گئی۔ بیواؤں کے ساتھ ان کے چھوٹے چھوٹے بچے یتیم اور لاوارث رہ گئے۔

(۶) ان ہنگامی حالات میں، اس کے سوا چارہ نہیں تھا کہ "ایک بیوی" کے اصولی قانون میں استثناء

(EXCEPTION) کر دی جائے۔ اس مقصد کے پیش نظر قرآن نے کہا کہ

وَ اِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی فَانْکِحُوْا مَا طَابَ لَکُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰی وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ ۚ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً .....(۴/۳)۔

اس آیت کے تین حصے ہیں اور تینوں کا ترجمہ اور مفہوم حسب ذیل ہے۔

(۱) وَ اِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی.....

اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ تم یتامیٰ کے ساتھ انصاف نہیں کر سکو گے..... تو

عربی زبان میں "یَتٰمٰی" یتیم بچوں کو بھی کہتے ہیں اور ان عورتوں کو بھی جن کے شوہر نہ ہوں۔ (خود قرآن کریم میں یَتَامَی النِّسَاءِ انہی معنوں میں آیا ہے۔ ۴/۱۲۷)۔ لہٰذا آیت کا مفہوم یہ ہوا کہ اگر ایسے حالات پیدا ہو جائیں جس میں تم دیکھو کہ معاشرہ میں یتیم بچے اور بے شوہر کی عورتیں زیادہ ہو گئی ہیں، اور "ایک مرد۔ ایک عورت" کے اصول کے مطابق ان کے مسئلہ کا منصفانہ حل نہیں مل سکتا تو کیا کرو؟

(۲) فَانْکِحُوْا مَا طَابَ لَکُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰی وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ ۚ

ان میں سے جو عورتیں تمہیں پسند ہوں، ان سے نکاح کر لو۔ دو، دو۔ تین، تین۔ چار، چار تک

یعنی ایسی صورت میں، "ایک بیوی" کے اصول میں استثنا کر لو اور ان بے شوہر عورتوں کو اپنے خاندان کا جزو بنا لو جتنی ان کی تعداد ہو اس لحاظ سے۔ مقصد یہ ہے کہ یہ لاوارث عورتیں اور ان کے بچے، مختلف خاندانوں میں جذب ہو جائیں۔

(۳) فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً

لیکن اگر تمہیں خدشہ ہو کہ تم عدل نہیں کر سکو گے، تو پھر وہی "ایک بیوی کا اصول برقرار رہے گا۔

بات بالکل صاف ہے۔ "عدل" کے متعلق قرآن کریم نے آگے چل کر کہہ دیا کہ جہاں تک جذبات کا تعلق ہے، ان میں یکسانیت کا سلوک تو ناممکن ہے۔ اتنی احتیاط رکھو کہ ایک کی طرف اتنا نہ جھک جاؤ کہ دوسری اُدھر لٹکی رہ جائے (۴/۱۲۹)..... کہاں وہ بیوی جو تمہاری عمر بھر کی رفیقہ ہے۔ جس کی وجہ سے گھر جنت کا نمونہ بن رہا ہے۔ اور کہاں یہ، جسے تم محض معاشرہ کی ایک اجتماعی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے جزو خاندان بنا رہے ہو۔ تمہارے جذبات دونوں کے ساتھ یکساں نہیں ہو سکتے۔ لیکن اس سے یہ نہ ہو کہ یہ نو آمدہ — جو بچاری پہلے ہی مصیبت زدہ۔

بیکس اور لاوارث ہے ـــــ نہ اِدھر کی رہے نہ اُدھر کی۔

پہلی بیوی کی رضامندی

یہ بھی ظاہر ہے کہ دوسری بیوی لانے کے لئے، پہلی بیوی کی رضامندی ضروری ہے۔ اس لئے کہ

(۱) قرآن کریم نے ازدواجی زندگی کا مقصد یہ بتایا ہے کہ میاں بیوی میں باہمی محبت اور رفاقت کے تعلقات ہوں اور گھر میں سکون و اطمینان رہے۔ ظاہر ہے کہ اگر دوسری شادی پہلی بیوی کی مخالفت کے باوجود کی جائے تو پہلی بیوی کے ساتھ محبت اور موانست خاک رہ جائے گی، اور گھر میں سکون و اطمینان کہاں باقی رہے گا؟ ایسا ہونا ناممکن ہے! اس لئے پہلی بیوی کی عدم رضامندی سے دوسری بیوی لائی ہی نہیں جا سکتی۔ قرآن کا یہ منشاء نہیں کہ کسی اجڑے ہوئے کنبہ کو آباد کرنے کے لئے، اپنے بستے رہتے گھر کو ویران کر دیا جائے۔

(۲) قرآن کریم نے دوسری شادی کے لئے عدل کی شرط عائد کی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب پہلی بیوی، دوسری شادی کی مخالفت کر رہی ہو، اور اس کی مخالفت کے علی الرغم دوسری بیوی گھر میں آ جائے، تو پہلی بیوی سے عدل کس طرح ہو سکے گا؟

(۳) قرآن نے کہا ہے کہ اگر میاں بیوی میں ناچاقی ہو جائے تو ایک ثالثی بورڈ قائم کرو تا کہ ان دونوں میں مصالحت کرا دی جائے۔ اگر ان میں مصالحت نہ ہو سکے تو پھر نکاح فسخ کر دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ جب دوسری شادی پہلی بیوی کی مخالفت کے باوجود کی جائے گی، تو (پہلے) میاں بیوی میں ناچاقی اُسی وقت شروع ہو جائے گی، اور اس ناچاقی کی وجہ وہ ہو گی (یعنی دوسری بیوی) جس کی موجودگی میں مصالحت کی کوئی صورت ہی نہیں ہو سکے گی۔ اس کی صورت یہی ہو گی کہ یا پہلی بیوی کو (ناحق) طلاق دیدی جائے، یا دوسری بیوی کو۔

یہ چیز کہ دوسری شادی کے لئے، پہلی بیوی کی رضامندی ضروری ہے، خود نبی اکرمؐ کے ایک ذاتی فیصلہ سے بھی ثابت ہے۔

> ایک دفعہ حضرت علیؓ نے دوسرا نکاح کرنا چاہا۔ آنحضرت (صلعم) کو معلوم ہوا تو سخت برہم ہوئے۔ آپ نے مسجد میں خطبہ دیا۔ اس میں اپنی ناراضی ظاہر کی۔ فرمایا۔ "میری لڑکی میرا جگر گوشہ ہے۔ جس سے اُسے دکھ پہنچے گا، مجھے اذیت ہو گی"۔ چنانچہ حضرت علیؓ اس ارادے سے باز آ گئے اور حضرت فاطمہؓ کی زندگی تک دوسرا نکاح نہ کیا۔
>
> (سیرۃ النبی علامہ شبلی۔ جلد دوم۔ صفحہ ۶۲۷۔ بحوالہ بخاری)

ظاہر ہے کہ رسول اللہؐ نے جو کچھ اپنی بیٹی کے متعلق فرمایا ہے اس کا اطلاق امت کی ہر بیٹی پر ہو گا۔ اس لئے

جس دوسرے نکاح سے پہلی بیوی کو دکھ پہنچے، وہ رسول اللہؐ کے اس فیصلہ کے مطابق بھی جائز نہیں قرار پا سکتا۔ کہا جائے گا کہ پہلی بیوی، دوسری شادی کی اجازت کیسے دے گی! سو پہلی بات تو یہ ہے کہ جن حالات کے پیش نظر قرآن نے دوسری شادی کی اجازت دی ہے ان میں، مومن عورتیں اپنے خانماں برباد، لاوارث، بیکس بہنوں کی امداد کیلئے یقیناً آگے بڑھ آتی ہوں گی (اور انہی جیسے حالات میں، مومن عورتوں سے توقع کیا جا سکتی ہے کہ وہ آگے بڑھیں گی)۔ علاوہ ازیں دوسری بیوی بھی، پہلی بیوی کے سر پر سوار ہونے کا جذبہ لے کر نہیں آئے گی۔ وہ اس کی ممنون احسان ہوگی۔

لیکن اس کے باوجود، اگر پہلی بیوی کسی وجہ سے، دوسری شادی کے حق میں نہیں، تو دوسری شادی کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔

بے شوہر کی عورتوں کا منصفانہ حل اسی صورت میں مل سکتا ہے جب وہ اس طرح جزو خاندان بنائی جائیں کہ گھروں کا امن و سکون قائم رہے اور پہلے میاں بیوی میں محبت اور رفاقت کا تعلق بدستور باقی رہے۔ اگر اس سے گھر جہنم بن جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم نے ایک مشکل کا حل تلاش کرتے کرتے دس مشکلات اور پیدا کر لیں۔

دوسری شادی کے لئے، قرآن کریم میں صرف یہی ایک آیت ہے جسے اوپر درج کیا جا چکا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ دوسری شادی کے لئے تین شرطیں ضروری ہیں۔

اول۔ بیوہ عورتوں اور یتیم بچوں کے مسئلہ کی موجودگی۔

دوم۔ پہلی بیوی کی رضامندی۔ اور

سوم۔ دونوں بیویوں میں معاشرتی سلوک کی برابری۔

حضورؐ کا اسوۂ حسنہ

اگر ان میں سے کوئی ایک شرط بھی موجود نہیں تو قرآن کی رو سے دوسری شادی کی اجازت نہیں۔ نہ ہی مقصد اوّل کے علاوہ کسی اور مقصد کے لئے دوسری شادی کی اجازت ہے۔ خود نبی اکرمؐ کا اسوۂ حسنہ بھی اس پر دلالت کرتا ہے۔

(۱) حضورؐ نے پچیس سال کی عمر تک شادی نہیں کی اور ساری جوانی سپیدۂ سحر کی طرح بے داغ رہی۔

(۲) پچیس سال کی عمر میں ایک صاحبِ اولاد بیوہ سے شادی کی جن کی عمر اُس وقت چالیس سال کی تھی۔

(۳) جب تک وہ بیوی (حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ) زندہ رہیں، حضورؐ نے دوسری شادی نہیں کی، حالانکہ ان کی عمر وفات کے وقت قریب پینسٹھ سال سے بھی زیادہ تھی۔ یعنی بیوی کی اس قدر عمر رسیدگی کے باوجود، دوسری شادی کا خیال تک نہیں کیا۔ رو واضح رہے کہ اُس وقت حضورؐ کی نرینہ اولاد بھی کوئی نہیں تھی۔ جو لڑکے پیدا ہوئے تھے

وہ وفات پا چکے تھے)۔

(یہی حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد صرف ایک شادی ہے جو حضورؐ نے غیر شادی شدہ عورت (حضرت عائشہؓ) سے کی - باقی تمام نکاح، ان ہنگامی حالات میں ہوئے جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے، اوران عورتوں سے جو (کئی کئی بار کی) بیوہ یا مطلقہ تھیں اور لاوارث و بے کس، بالعموم عمر رسیدہ، مقصد اس سے اِن محتاجوں اور بے کسوں کی پناہ دہی تھی - چنانچہ باسورتھ سمتھ (BOSWORTH SMITH) اس باب میں لکھتا ہے کہ

> محمدؐ کی شادیوں کی توجیہہ جس طرح اور مقاصد کے ماتحت کی جا سکتی ہے اسی طرح اس مقصد کے ماتحت بھی کہ اس سے کس مپرس، بے نوا افراد کے حالات پر ترس کھانا مقصود تھا۔ چنانچہ یہ ان عورتوں سے ہوئیں جو قریب قریب سب کی سب بیوہ تھیں اور نہ اپنے حسن وجمال اور نہ مال و دولت کی بنا پر کوئی شہرت رکھتی تھیں۔ بلکہ صورت حالات اس کے بالکل برعکس تھی۔
>
> (MOHAMMAD AND MOHAMMADANISM)

باقی رہا یہ کہ ان شادیوں میں، پہلی ازواج مطہراتؓ کی رضامندی شامل ہوتی تھی۔ سو اس کا ثبوت یہ ہے کہ یہ (پہلی بیویاں) ہر نئی آنے والی بیوی کا خیر مقدم کرتی تھیں اور اسے مبارکباد دیتی تھیں۔ اگر یہ شادیاں ان کی مرضی کے خلاف ہوتیں تو وہ آنے والی کے استقبال اور مبارکباد کے لئے کبھی آگے نہ بڑھتیں۔

یہ ہے قرآن کی رُو سے تعدد ازواج (ایک سے زیادہ بیویوں) کی پوزیشن - لیکن ہمارے ہاں دوسری

ہمارے ہاں کی حالت

شادیوں کے سلسلہ میں، صورت ہی بالکل مختلف ہے - سب سے پہلے تو یہ کہ اس ضمن میں اس شرط کا کبھی ذکر تک نہیں کیا جاتا ہے جسے قرآن نے بنیاد قرار دیا، اور سب سے پہلے بیان کیا ہے یعنی وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی ــــ بیوگان اور یتامیٰ کا مسئلہ۔ اس کے برعکس ایک سے زیادہ شادیوں کے جواز ـــ بلکہ ضرورت ـــ کے لئے اس قسم کے دلائل دیئے جاتے ہیں مثلاً۔

لہ ہم نے اس جگہ اور دیگر مقامات پر حضورؐ کے اسوۂ حسنہ کے متعلق جو کچھ لکھا ہے ان روایات کو ہم اس لئے صحیح مانتے ہیں کہ وہ قرآن کریم کی تعلیم کے مطابق ہیں۔ یہی، روایات کے صحیح یا غلط ہونے کا بنیادی معیار ہے۔

(۱) انسان کے جنسی جذبہ کی تسکین کے لئے ایک سے زیادہ بیویوں کی ضرورت ہے ــــــ چار تک بیویاں، اور ان کے ساتھ بلا تعداد لونڈیاں۔

ذرا غور کیجئے کہ اس دلیل کی رو سے صورت کیا سامنے آتی ہے۔ یعنی یہ کہ ان حضرات کے نزدیک

(الف) شادی سے مقصد صرف جنسی جذبہ کی تسکین ہے۔ اور

(ب) عورت صرف اس لئے پیدا کی گئی ہے کہ وہ مرد کے جنسی تقاضا کی تسکین کا ذریعہ بنے۔

(الف) کے متعلق یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ قرآن کریم نے جنسی جذبہ کے متعلق کہیں ایسا نہیں کہا کہ اس کی تسکین ناگزیر ہے۔ نہ ہی یہ کہ اس باب میں ضبط نفس ناممکن ہے۔ اس نے کھانے پینے کے معاملہ میں تو یہ کہہ دیا ہے کہ اگر کبھی اضطراری حالت پیدا ہو جائے تو ضرورت کے مطابق، حرام بھی کھا لیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس نے جنسی جذبہ کے لئے اضطراری حالت کو کہیں تسلیم نہیں کیا۔ بلکہ کہا یہ ہے کہ وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِينَ لَا يَجِدُونَ نِكَاحًا (۲۴/۳۳)۔ جو لوگ نکاح کا سامان نہ پا سکیں، انہیں چاہیئے کہ وہ اپنے آپ پر ضبط رکھیں۔ لہٰذا یہ کہنا قرآن کی تعلیم کے خلاف ہے کہ جنسی جذبہ کی تسکین ناگزیر ہے۔ اگر ایک بیوی سے کام نہ چلے، تو چار بیویاں کر لو اور اس کے بعد لونڈیاں بھی!

زناکاری

کہا جاتا ہے کہ اگر ایک سے زیادہ بیویوں کی اجازت نہ ہو تو انسان زنا کے لئے مجبور ہو جاتا ہے۔ اور اس کے لئے یورپ کی مثال پیش کی جاتی ہے چنانچہ گذشتہ دنوں ایک صاحب نے یہاں تک فرما دیا کہ یورپ میں جو اس قدر حرامی بچے پیدا ہوتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ وہاں تعددِ ازدواج کی اجازت نہیں۔

اس سلسلہ میں آپ اپنے معاشرہ پر غور کیجئے اور دیکھئے کہ آپ کو کتنے لوگ ایسے ملتے ہیں جن کی صرف ایک بیوی ہے اور وہ دوسری بیوی نہ ہونے کی وجہ سے حرامی بچے پیدا کرتے پھر رہے ہیں!

اور کتنے لوگ ایسے ہیں جو دو، دو۔ تین تین بیویاں رکھنے کے باوجود، زنا کے مرتکب ہوتے رہتے ہیں!

اب رہا یورپ۔ سو وہاں زنا کا عام ہونا اور حرامی بچوں کی کثرت اس لئے نہیں کہ انہیں ایک سے زیادہ بیویوں کی اجازت نہیں۔ (وہاں تو اب، لوگ عام طور پر ایک شادی بھی نہیں کرتے حالانکہ عورتوں کی اس قدر افراط ہے)۔ وہاں زنا کی وجہ یہ ہے کہ ان کے ہاں، زنا (یعنی ایک غیر شادی شدہ بالغ لڑکے اور لڑکی کا باہمی رضا مندی سے جنسی اختلاط) نہ قانوناً جرم ہے۔ نہ معاشرہ اسے معیوب سمجھتا ہے۔

واضح رہے کہ زنا کی روک تھام کا یہ طریق نہیں کہ زیادہ تعداد میں عورتیں (بیویاں) مہیا ہوتی جائیں اس کے انسداد کا طریق یہ ہے کہ

(۱) بچپن سے عفت و عصمت کی اہمیت کی تعلیم دی جائے۔

(۲) جنسی جذبہ کے متعلق یہ خیال دور کیا جائے کہ ایک طبیعی ضرورت (BIOLOGICAL NECESSITY) ہے جس کا پورا کیا جانا بہر حال ضروری، بلکہ ناگزیر ہے۔ اس کے برعکس یہ بتایا جائے کہ یہ محض ایک نفسیاتی تحریک (PSYCHOLOGICAL URGE) ہے جو کبھی بیدار نہیں ہوتی تاوقتیکہ اسے خیالات کی رُو سے، خود بیدار نہ کیا جائے۔ اگر اسے بیدار نہ کیا جائے تو جنسی اختلاط کی ضرورت ہی لاحق نہیں ہوگی۔ انہیں یہ بھی بتایا جائے کہ اس طرح کی بیداری سے نہ کوئی طبیعی بیماری لاحق ہوتی ہے، نہ نفسیاتی عارضہ۔ بلکہ اس سے انسانی توانائیاں محکم تر ہوتی جاتی ہیں۔ جنسی اختلاط افزائشِ نسل کا ذریعہ ہے، مقصود بالذات نہیں۔

(۳) اس کے بعد زنا کو سنگین جرم قرار دیا جائے اور اس کی سخت سزا دی جائے۔ صرف زنا ہی کو نہیں بلکہ تمام جنسی محرکات ۔۔۔ مثلاً فحش لٹریچر، سینما کی حیا سوز تصاویر، شراب وغیرہ ۔۔۔ کو بھی جرم قرار دیا جائے۔

یہ کیجئے اور پھر دیکھئے کہ زنا کے واقعات کس قدر کم ہو جاتے ہیں۔ قرآن کریم نے زنا کے انسداد کا طریق یہ بتایا ہے۔ اس نے کہیں یہ نہیں کہا کہ زنا کو روکنے کا طریقہ تعددِ ازدواج ہے۔ نہ ہی اس نے یہ کہا ہے کہ تعددِ ازدواج کی اجازت اس لئے دی جاتی ہے کہ تمہارے جنسی جذبہ کی تسکین ہوتی رہے۔

عورت کی حیثیت

اب لیجئے شق (ب) ۔۔۔ یعنی یہ کہ عورت کی پیدائش کا مقصد ہی یہ ہے کہ وہ مرد کی جنسی ضرورت پوری کرنے کا ذریعہ بنے ۔۔۔ ہمارے نزدیک اس سے زیادہ عورت کی توہین اور تذلیل کچھ اور ہو نہیں سکتی۔ ایک طرف ہم دنیا میں ڈھنڈورا پیٹتے ہیں کہ اسلام نے سب سے پہلے عورت کو اس کے صحیح مقام سے روشناس کرایا۔ اور دوسری طرف ہم عورت کا مقام یہ متعین کرتے ہیں کہ اس کی ہستی مقصود بالذات نہیں بلکہ مرد کے جنسی تقاضا کے پورا کرنے کا ذریعہ ہے۔ یاد رکھئے۔ جب کسی انسان کا وجود مقصود بالذات نہ رہے بلکہ کسی دوسرے انسان کے مقصد کو پورا کرنے کا ذریعہ بن جائے، تو اسے غلامی کہتے ہیں۔ ہمارے ہاں کے اس تصور نے کہ عورت، مرد کے جذبۂ جنسی کی تسکین کا ذریعہ ہے، عورت کی حیثیت بالکل غلام کی سی بنا دی ہے۔ اور یہ چیز اسلام کی بنیادی تعلیم کے خلاف ہے کہ کوئی فرد کسی دوسرے فرد کا غلام ہو۔ چہ جائیکہ خود انسان کی ایک پوری کی پوری صنف، دوسری صنف کی غلام بن کر رہ جائے!

مروجہ عائلی قوانین

مروجہ عائلی قوانین میں اگرچہ یہ کہا گیا ہے کہ ثالثی کونسل کی منظوری کے بغیر دوسری شادی نہیں کی جا سکتی لیکن دوسری شادی سے متعلق قانون، دیگر امور میں، قرآنی احکام سے پیچھے، اور بعض صورتوں میں ان کے نقیض

ہے۔ مثلاً

(۱) اس میں، پہلی بیوی کی رضامندی کو شرط لاینفک قرار نہیں دیا گیا۔ اسے، دوسری شادی کے جواز کے لئے، منجملہ دیگر وجوہات محض ایک وجہ قرار دیا گیا ہے۔ یہ غلط ہے۔ پہلی بیوی کی رضامندی بنیادی اور لاینفک شرط ہونی چاہیئے۔

(۲) اس میں دوسری شادی کی وجۂ جواز قرآنی قرار نہیں دی گئی ۔۔۔ یعنی بیوگان اور یتامیٰ کے مسئلہ کا حل۔ اس میں ایسی وجوہات دی گئی ہیں جنہیں قرآن وجۂ جواز قرار ہی نہیں دیتا۔ مثلاً

(۱) بانجھ پن۔ یہ وجہ بڑی ہی رکیک بلکہ تاسف انگیز ہے۔ نکاح کا اولیں مقصد، میاں بیوی کی رفاقت (COMPANIONSHIP) ہے۔ افزائش نسل ثانوی مقصد ہے۔ اگر مقصد اول حاصل ہے تو محض اولاد کی خاطر دوسری بیوی لاکر، پہلی رفیقہ کی زندگی کو جہنم بنا دینا، کہاں کا انصاف ہے۔ قرآن نے یہ ضرور کہا ہے کہ اولاد وجۂ زینت ہے (اور باعث فتنہ بھی)۔ لیکن یہ کہیں نہیں کہا کہ اگر تم اولاد پیدا کر کے نہ آئے تو تم سے باز پرس ہوگی۔ اس نے تو بلکہ یہ کہا ہے کہ مشیت کا قانون طبیعی ایسا ہے جس کی رو سے بعض کے ہاں لڑکے پیدا ہوتے ہیں۔ بعض کے لڑکیاں۔ بعض کے ہاں لڑکے لڑکیاں دونوں۔ اور بعض بے اولاد رہتے ہیں۔ (۴۹/۴۲)۔ اس نے یہ نہیں کہا کہ جو بے اولاد ہوں وہ دوسری بیوی لاکر اولاد پیدا کریں۔ لہٰذا، بانجھ پن نہ وجہ طلاق ہو سکتا ہے اور نہ دوسری شادی کے لئے وجۂ جواز۔

(ب) جسمانی معذوری۔ اور ازدواجی تعلقات کے لئے جسمانی ناقابلیت

کیا یہ انسانیت ہے کہ جب تک بیوی تندرست و توانا رہے، اس وقت تک وہ رفیقۂ حیات ہو۔ اور جب وہ بیچاری بیمار ہو جائے یا کسی اور حادثہ کا شکار، تو اسے دھکا دیدیا جائے۔ اس وقت تو وہ اور زیادہ توجہ کی مستحق ہوگی۔ اس شق کی تہ میں بھی وہی تصور کارفرما ہے کہ عورت، مرد کے جذبۂ جنسی کی تسکین کا ذریعہ ہے۔ اگر ایک بیوی اس مقصد کو پورا نہیں کرتی تو دوسری سے شادی کر لی جائے۔ اس تصور کے ماتحت عورت کی حیثیت ایک مستعمل شے (THING OF UTILITY) کی رہ جاتی ہے واجب التکریم انسان کی نہیں۔

مروجہ عائلی قوانین کی اس شق کو، قرآن کریم کے مطابق تبدیل کرنے کی ضرورت ہے۔ یعنی یہ کہ دوسری شادی کی اسی صورت میں اجازت دیجا سکتی ہے جب

(i) بیوگان اور یتامیٰ کا مسئلہ لاینحل ہو رہا ہو۔

(ii) پہلی بیوی کی رضامندی بطیب خاطر شامل ہو۔ اور

(iii) مرد عدل کرسکنے کے قابل ہو۔ اس میں، مرد کے لئے، دو کنبوں کے اخراجات کے متحمل ہونے کی شرط بھی ضروری ہے۔ قرآن نے اس کی بھی صراحت کی ہے ــــ ذَٰلِكَ أَدْنَىٰ أَلَّا تَعُولُوا (۴/۳)۔

۶۔ وراثت

موجودہ عائلی قوانین میں ایک شق یہ بھی ہے کہ

اگر وراثت کے شروع ہونے سے پہلے، مورث کے کسی لڑکے یا لڑکی کی موت واقع ہوجائے تو ایسے لڑکے یا لڑکی کے بچوں کو (اگر کوئی ہوں) بحصہ رسدی وہی ملے گا جو اس لڑکے یا لڑکی کو (جیسی کہ صورت ہو) زندہ ہونے کی صورت میں ملتا۔

یہ بات حسب ذیل نقشہ سے سمجھ میں آسکے گی۔

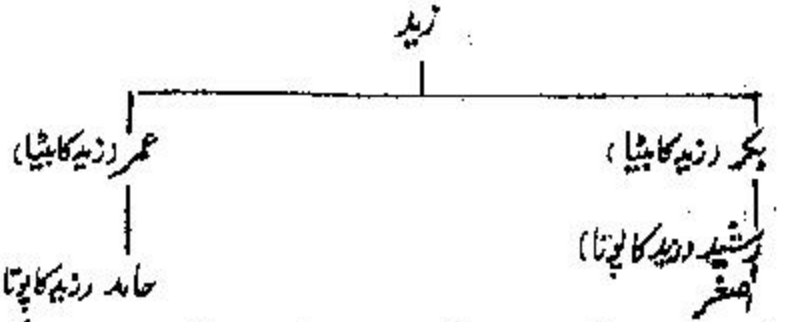

اگر زید کی زندگی میں بکر فوت ہو جائے تو رشید یتیم رہ جائے گا۔ اس کے بعد جب زید کی وفات ہوگی تو، حضرات علمائے کرام کے ارشاد کے مطابق، زید کی جائیداد میں سے رشید (یتیم پوتے) کو کچھ نہیں ملے گا۔ ساری جائیداد، عمر کو مل جائے گی۔ اور اس کے بعد اس کے بیٹے (حامد) کو۔ رشید اپنے دادا کی جائیداد سے اس لئے محروم کر دیا گیا کہ وہ بیچارا یتیم رہ گیا تھا!

عائلی قوانین میں کہا گیا ہے کہ (یہ اس یتیم کے ساتھ بڑی بے انصافی ہے)۔ زید کی وفات پر، رشید کو وہی حصہ ملنا چاہیئے جو اس کے باپ کو ملتا۔ یہ قانون، قرآن کریم کی تعلیم کے عین مطابق ہے۔ قرآن کریم میں وراثت کے احکام کے سلسلہ میں فرمایا:-

(۱) لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ .... (۴/۷)

جو کچھ "والدین" چھوڑ کر مریں، اس میں سے ایک حصہ مردوں کا ہے۔

(۲) يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ .... (۴/۱۱)

اللہ تمہاری "اولاد" کے متعلق تمہیں حکم دیتا ہے (کہ ترکہ کی تقسیم یوں کیا کرو)۔

ان آیات میں کہا یہ گیا ہے کہ جو کچھ "والدین" چھوڑ کر مریں، اس میں سے "اولاد" کو یوں حصہ ملے گا (اس کے بعد قرآن نے حصے بتائے ہیں)۔ ہمارے ہاں "والدین" سے مراد صرف ماں باپ۔ اور "اولاد" سے مراد صرف بیٹا۔ بیٹی ہوتے ہیں۔ لیکن عربی زبان میں "والد" میں باپ، اور باپ کے والد (والد (دادا، پردادا وغیرہ) اوپر تک سب شامل ہوتے ہیں۔ اسی طرح "ولد" میں بیٹا اور بیٹے کی اولاد (اولاد (پوتا۔ پرپوتا وغیرہ) نیچے تک سب شامل ہوتے ہیں۔ اس اعتبار سے، نقشے میں دیکھئے۔ رشید اور حامد بھی زید کی "اولاد" ہیں۔ زید کی وفات کے وقت اگر بکر زندہ ہے تو اس کا حصہ اسے ملے گا۔ اس لئے کہ وراثت کا قانون یہ ہے کہ مرنے والے کی لائن میں جو سب سے پہلا وارث ہو، اس کی موجودگی میں، اسی لائن میں نیچے والا؛ وارث نہیں ہو سکتا۔ یعنی بکر کی موجودگی میں رشید، اپنے دادا کے ترکہ کا وارث نہیں ہو سکتا۔ لیکن جب بکر پہلے فوت ہو چکا ہو تو پھر رشید "اولاد" کی جگہ لے لیگا۔ اس طرح اسے دادا کی وراثت سے حصہ مل جائے گا۔

اس سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ عائلی قوانین میں اس باب میں جو کچھ کہا گیا ہے، وہ قرآن کریم کے مطابق ہے۔ اس میں البتہ ذراسی ترمیم کی ضرورت ہے۔ اگر زید کی وفات سے پہلے، بکر اور رشید دونوں مر چکے ہوں، تو پھر رشید کا بیٹا اصغر "اولاد" میں شامل ہو جائے گا اور اپنے پردادا کی جائیداد میں سے وہی حصہ پائے گا جو رشید کو ملتا۔ موجودہ قوانین میں اس قسم کا اضافہ کر دینا ضروری ہے۔

اسمبلی میں پیش کردہ تحریک

تصریحات بالا سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ عائلی قوانین میں جو کچھ کہا گیا ہے، ان میں سے کوئی شق بھی قرآن کریم کے خلاف نہیں۔ بعض شقوں کو قرآن کریم کے احکام کے عین مطابق کرنے کے لئے کچھ ترمیمات کی ضرورت ہے لیکن اصولی طور پر ان میں کوئی بات قرآن کریم کے خلاف نہیں۔ ان قوانین کی رو سے، عورتوں اور یتیم اولاد کو

وہ حقوق دلانے کی طرف پہلا قدم اٹھایا گیا ہے جو قرآن کریم نے انہیں عطا کئے تھے لیکن جن سے انہیں بدقسمتی سے محروم کر دیا گیا تھا۔

لیکن قوم کی بدنصیبی ملاحظہ ہو کہ ہماری نیشنل اسمبلی کے پہلے سیشن (منعقدہ جون - جولائی ۱۹۶۲ء) میں یہ تحریک پیش کر دی گئی کہ ان قوانین کو منسوخ قرار دیا جائے اور ان کی بجائے، وہی پرانے قوانین رائج کر دیئے جائیں جن کی رُو سے

(۱) والدین (یا دیگر سرپرست)، نابالغ لڑکوں اور لڑکیوں کی شادی جس جگہ جی چاہے کر دیں۔

(۲) مرد کو یہ حق حاصل ہو کہ وہ جب جی چاہے، طلاق - طلاق - طلاق کہہ کر اپنی بیوی کو الگ کر دے۔ لیکن اگر بیوی کسی ظالم خاوند کے پنجہ سے رہائی حاصل کرنا چاہے، تو اسے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانا پڑے۔

(۳) مرد کو حق حاصل ہو کہ جب جی چاہے، دو، تین، چار تک بیویاں کر لے۔ اور

(۴) یتیم پوتے کو اس کے دادا کی وراثت سے محروم رکھا جائے۔

جیسا کہ پہلے صراحت سے لکھا جا چکا ہے، یہ چاروں شقیں قرآن کریم کے احکام کے صریحاً خلاف ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ جو بات قرآن کے خلاف ہے وہ اسلام کے بھی خلاف ہے۔ لیکن اب اصرار ہے کہ قانون یہی رائج ہونا چاہیئے۔ غنیمت ہے کہ عائلی قوانین کو منسوخ کرنے کی تحریک کا فیصلہ پہلے سیشن میں ہی نہیں ہو گیا۔ طے یہ پایا ہے کہ اسے پہلے "اسلامی مشاورتی کونسل" کی طرف بھیجا جائے۔ اس کے بعد یہ (غالباً) اسمبلی کے آئندہ سیشن میں پیش ہو گا۔

بدقسمتی سے ملک میں فضا ایسی پیدا کر دی گئی ہے کہ جو مسئلہ سامنے آتا ہے، اس پر دلائل و براہین اور علم و بصیرت کی روشنی میں، ٹھنڈے دل سے غور کرنے کے بجائے، عوام کے جذبات کو بھڑکا دیا جاتا ہے اور اس طرح، دین و دانش، سب اس سیلاب کی زد میں بہ جاتے ہیں۔ ہمارے ہاں ایک طبقہ وہ ہے جس نے قسم اٹھا رکھی ہے کہ حکومت جو قدم اٹھائے اس کی بہرحال مخالفت کی جائے، خواہ وہ اقدام کتنا ہی معقول کیوں نہ ہو۔ دوسرا طبقہ وہ ہے جس کا دھرم ایمان "یہ ہے کہ عورت کو ہمیشہ جوتے تلے رکھنا چاہیئے۔ وہ اسے برداشت ہی نہیں کر سکتے کہ عورتوں کو کسی قسم کے حقوق حاصل ہوں۔ تیسرا طبقہ وہ ہے جس کے نزدیک کسی بات کے صحیح ہونے کی سند اور دلیل فقط یہ ہے کہ ایسا صدیوں سے ہوتا چلا آ رہا ہے، اس لئے اس میں کوئی تبدیلی نہیں کی جا سکتی۔

ظاہر ہے کہ ان میں سے کوئی روش بھی صحیح نہیں قرار دی جاسکتی - ہم مسلمان ہیں۔ ہمارے لئے صحیح اور غلط کا اولین اور بنیادی معیار، خدا کی کتاب ہے۔ ہمیں تمام جذبات اور رجحانات سے الگ ہو کر دیکھنا یہ چاہیئے کہ اس باب میں وہ کتاب ہمیں کیا راہ نمائی دیتی ہے۔ ہمارے آئین میں یہ شق موجود ہے کہ پاکستان میں کوئی ایسا قانون نافذ نہیں ہوگا جو اسلام کے خلاف ہو۔ ہم مرکزی مجلس قانون ساز اور (مجوزہ) اسلامی مشاورتی کونسل کے اراکین سے بالخصوص، اور ملک کے دوسرے سمجھنے سوچنے والے طبقہ سے بالعموم درخواست کریں گے کہ جو کچھ گذشتہ صفحات میں پیش کیا گیا ہے وہ اس پر نہایت سکون سے غور کریں اور پھر از خود اس نتیجہ پر پہنچیں کہ مسلمانوں کی عائلی زندگی سے متعلق کون سے قوانین، اسلام کے مطابق ہیں۔ اس ضمن میں اس بنیادی اصول کو پیش نظر رکھئے (اور ہمیں یقین ہے کہ آپ کا اس پر ایمان ہوگا) کہ

جو چیز قرآن کے خلاف ہوگی وہ کبھی اسلام کے مطابق نہیں ہو سکتی۔

نذرِ عقیدت

بحضور رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم

(بتقریب سعید عیدِ میلاد النبیؐ)

پرویز

خدائے جلیل نے اپنے بندوں سے جو کچھ
کہنا تھا آخری مرتبہ کہہ دیا۔ شرفِ انسانیت کی تکمیل کے
لئے جو قوانین دیئے جانے تھے وہ اپنی انتہائی شکل میں دیدیئے
گئے۔ اس کے بعد انسان کو اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لئے
کسی دوسری مشعلِ راہ کی ضرورت اور کسی اور ہادیٔ طریقت کی احتیاج
نہ رہی۔

اب

انسانیت کے مقامِ بلند تک پہنچنے کے لئے وہی ایک صراطِ مستقیم ہے جس پر
اس ذاتِ اقدس و اعظمؐ کے نقوشِ قدم جگمگ جگمگ کر رہے ہیں اور
جس کو دیکھ کر ہر خبیر و بصیر پکار اٹھتا ہے

مقامِ خویش اگر خواہی دریں دیر
بحق دل بند و راہِ مصطفیٰؐ رو

پرویز

(معراجِ انسانیت صفحہ ۱۷۸)

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وہ آئے بزم میں........

شجرِ زندگی کی ہر شاخ سے نمی خشک ہو چکی تھی۔ تہذیب و تمدن کے پھول وحشت و بربریت کی بادِ سموم سے مرجھا چکے تھے۔ حسنِ عمل کے زندگی بخش چشمے یکسر خشک ہو چکے تھے۔ زمین پر جوہرِ انسانیت کی سرسبزی و شادابی کا کہیں نشان تک باقی نہ تھا۔ کشتِ مذاہب و اخلاق کے حدود تو باقی تھے لیکن فصلیں بالکل اجڑ چکی تھیں۔ اس وحشت و سراسیمگی کے عالم میں خاسر و نامراد انسان ادھر اُدھر مارا مارا پھر رہا تھا، لیکن خدا کی اس وسیع زمین پر اسے کہیں زندگی کا نشان اور تازگی کا سراغ نہیں ملتا تھا۔ چاروں طرف سے مایوس و ناامید ہو کر اس کی نگاہیں رہ رہ کر آسمان کی طرف اٹھتی تھیں اور ایک پکار سننے والے کو پکار پکار کر کہتی تھیں کہ مَتٰی نَصْرُ اللّٰہِ۔ یہ وقت تھا کہ فطرت کے اٹل قانون نے اس افسردگی و پژمردگی کو پھر سے تازگی و شگفتگی میں بدل دیا۔

اس ربِ ذوالمنن کا سحابِ کرم، زندہ امیدوں اور تابندہ آرزوؤں کی ہزاروں جنتیں اپنے آغوش میں لئے، ربیع الاوّل کے مقدس مہینے میں فاران کی چوٹیوں پر جھوم کر آیا اور بلدِ امین کی مبارک وادیوں میں کھل کھلا کر برسا۔ انسانیت کی مرجھائی ہوئی کھیتیاں لہلہا اٹھیں، اخلاق و تمدن کے پژمردہ پھولوں پر پھر سے بہار آگئی۔ عمرانیت و مدنیت کے سبزۂ پامال میں نزہت و لطافت پیدا ہو گئی۔ اعمالِ صالحہ کے خشک چشمے، حیاتِ تازہ کی جوئے رواں میں تبدیل ہو گئے۔ طغیانی و سرکشی کی بادِ سموم، عدل و احسان کی جاں بخش نسیمِ سحری میں بدل گئی۔ فضائے عالم مسرتوں کے نغموں سے گونج اٹھی۔ انسان کو نئی زندگی اور زندگی کو نئے ولولے عطا ہوئے۔ آسمان نے جھک کے زمین کو مبارک باد دی کہ تیرے بختِ بلند نے یاوری کی اور تیرے خوش نصیب ذرّوں کو اس ذاتِ اقدس و اعظم کی پابوسی کی سعادت نصیب ہو گئی جو عالمِ موجودات کے سلسلۂ ارتقاء کی آخری کڑی ہے۔ جس سے شرف و مجدِ انسانیت کی

تکمیل ہوگئی - جو علم، بصیرت کے اس افق اعلیٰ پر جلوہ بار ہے جہاں عقل و عشق، ناسوت و لاہوت؛ یہ اور وہ توسین کی طرح آپس میں ملتے ہیں - جو دانش روحانی اور حکمتِ برہانی کے اس مقام بلند پر فائز ہے جہاں غیب و شہود کی وادیاں دامنِ نگاہ میں سمٹ کر آجاتی ہیں۔ تو ہمیں فطرت نے "جنت سے نکالے ہوئے ابن آدم" کے اس طالع بیدار کا تقدیس و تحمید کے زمزموں سے استقبال کیا - دنیا سے طاغوتی قوتوں کے تخت اُلٹ گئے کہ وہ آنے والا آگیا جس کی آمد ملوکیت و قیصریت کے لئے پیغامِ فنا تھی - ایران کے آتش کدوں کی آگ ٹھنڈی پڑ گئی کہ اب انسانی تصورات کی دنیا نار کی جگہ نور سے معمور ہوگئی - دنیا کے صنم کدوں کے بت...... پاش پاش ہوگئے کہ آج مسلکِ ابراہیمی کی تکمیل کا دن آگیا۔ شیاطین نے پہاڑوں میں جا کر منہ چھپا لیا کہ اب جور و استبداد کی ہر طاغوتی قوت کے روپوش ہونے کا وقت آگیا۔ دنیا سے باطل کی تاریکیاں دور ہوگئیں کہ آج اس آفتاب عالم تاب کا طلوع ہوا جس کے بھیجنے والے نے اسے جگمگاتا چراغ کہہ کر پکارا — إِنَّا أَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِيرًا وَّ دَاعِيًا إِلَى اللّٰهِ بِإِذْنِهٖ وَ سِرَاجًا مُّنِيرًا - وہ آنے والا جس کی آمد کا مقصد یہ بتایا گیا تھا کہ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلٰلَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ - جب وہ آیا تو اس نے ان تمام اغلال و سلاسل کو ایک ایک کر کے توڑ دیا جن میں انسانیت جکڑی ہوئی چلی آرہی تھی - احبار و رہبان کی رہبانیت کے طوق و سلاسل، قیصر و کسریٰ کی زنجیریں، توہم پرستی کی بصیرت سوز بندشیں، تقسیم انسانیت کے انسانیت کش نسلی، جغرافیائی، وطنی، غیر فطری معیار، سب ایک ایک کر کے ٹوٹتے چلے گئے اور پابند قفس، طائر لاہوتی کو پھر سے آزادی کی فضائے بسیط میں، اذن بال کشائی عطا ہوا - اور انسان ایک بار پھر زمین پر سر اونچا کر کے چلنے کے قابل ہوگیا - انسانیت کو اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کی سیدھی راہ مل گئی - عقل کو عشق کا جنون اور عشق کو عقل کی فرزانگی عطا ہوئی - فقر کو شکوہ خسروی اور پادشاہی کو استغنائے قلندری عنایت ہوا - یہ تھی وہ ذاتِ گرامی کہ

محبت از نگاہش پائیدار است
سلوکش عشق و مستی را عیار است
مقامش عبدہٗ آمد ولیکن
جہانِ شوق را پروردگار است

إِنَّ ذٰلِكَ لَمُحْيِ الْمَوْتٰى (۳۰/۵۰)

اس طرح وہ دلوں کی مردہ بستیوں میں پھر سے زندگی کا سامان پیدا کر دیتا ہے - (معراجِ انسانیت صفحہ ۱۷۱ - ۱۷۲)

(۲) اے سوارِ اشہبِ دوراں بیا

جب مشیتِ ایزدی کی تدبیرِ محکم، جس کے لئے زمین و آسمان یوں قرنہا قرن سے سرگرداں پھر رہے تھے، اپنی تکمیل تک پہنچی۔ جب انسانیت، جس کے لئے کائنات نے ایک ایک ذرّے کو لاکھوں چکر دیئے تھے، گہوارۂ طفولیت سے حریمِ شباب میں آگئی۔ جب اس صحیفۂ فطرت کی تکمیل کا وقت آگیا جس کے ضلعت اوراق ستاروں کی ٹھنڈی ٹھنڈی مرمریں روشنی میں کوثر و تسنیم سے دھلے ہوئے قلم سے لکھے گئے تھے۔ جب سینۂ کائنات میں اتنی کشادگی پیدا ہوگئی کہ وہ اپنے اندر رازہائے درونِ پردہ کے معدنِ لعل و گہر کو سمولے، تو آسمان کی حوریں زمین پر اتریں کہ جنت کے تر و تازہ پھولوں سے وادیٔ بطحا کی تزئین و آرائش کر دیں۔ صحنِ گلستانِ کائنات پر بہار آگئی۔ ہر طرف سے مسرتوں کے چشمے ابلنے لگے۔ چاند مسکرایا۔ ستارے ہنسے۔ آسمان سے نور کی بارش ہوئی۔ فرشتوں کی معصوم نگاہوں میں اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ کی تفسیر ایک پیکرِ محبوبیت کا حسین تصور بن کر چمکنے لگی۔ فلک تعظیم کے لئے جھکا۔ زمین نے اپنی خاک آلود پیشانی سجدہ سے اٹھائی کہ آج اس کی قرنہا قرن کی دعاؤں کی قبولیت کا وقت آپہنچا تھا۔ صحرائے حجاز کے ذرّے جگمگا اٹھے۔ بلد امین کی گلیوں کا نصیبہ جاگا کہ آج اس آنے والے کی آمد آمد تھی جس کی طرف جبلِ تیمن پر حضرت نوحؑ نے اشارہ کیا تھا اور جسے کوہِ زیتون پر حضرت مسیحؑ نے اپنے حواریوں کو وجۂ تسکینِ خاطر بتایا تھا۔ جس کی آمد کی بشارتیں وادیٔ طورِ سینین میں بنی اسرائیل کو دی گئی تھیں۔ اور جس کے لئے دشتِ عرب میں حضرت خلیلِ اکبرؑ اور ذبیحِ اعظمؑ نے اپنے خدا کے حضور دامن پھیلایا تھا وہ آنے والا کہ جس کے انتظار میں زمانے نے لاکھوں کروٹیں بدلی تھیں آیا اور اس شانِ زیبائی و رعنائی سے آیا کہ زمین و آسمان میں تہنیت کے غلغلے بلند ہوئے۔ فرشتوں نے زمزمۂ تبریک گایا۔ سدرۃ المنتہیٰ کی حدود فراموش شاخوں نے جھولا جھلایا۔ ملاءِ اعلیٰ کی مقدس قندیلوں نے چراغاں کیا۔ کائنات کے ذرّے چمک اٹھے۔ فضائے عالم درود و صلوٰۃ کی فردوس گوش صداؤں سے گونج اٹھی اور انس و جان وجد و کیف کے عالم میں پکار اٹھے کہ

اے سوارِ اشہبِ دوراں بیا　　　اے فروغِ دیدۂ امکاں بیا
در جہانِ ذکر و فکرِ انس و جاں　　　تو صلوٰۃِ صبح، تو بانگِ اذاں

(معراجِ انسانیت۔ صفحہ ۱۷۳ - ۱۷۴)

(۳) مقامِ محمدیؐ

یہ آنے والا رسول کافۃً للناس اور رحمۃ للعالمینؐ بن کر آیا اور اپنے ساتھ وہ نظامِ عدل و حریت لایا جو انسان کو دنیا بھر کی غلامی سے آزادی دلانے کا کفیل تھا۔ یہ پیغام کوئی انوکھا پیغام اور یہ تعلیم کوئی نئی تعلیم نہ تھی۔ صداقت جہاں کہیں بھی تھی اسی کتابِ مبین کا کوئی نہ کوئی ورق تھی جو حضورؐ کی وساطت سے دنیا کو ملی۔ روشنی جس مقام میں بھی تھی وہ اسی قندیلِ آسمانی کی کوئی نہ کوئی کرن تھی جو قلبِ محمدیؐ میں اتاری گئی۔ مشامِ جان نے جہاں کہیں بھی عطر بیزی و عنبر فشانی کی وہ لالہ و یاسمن کی انہی پتیوں کی رہینِ منت تھی جن کا گلدستہ اس نبی آخر الزماںؐ کے مقدس ہاتھوں محرابِ کعبہ میں رکھا گیا۔

پیغامِ محمدیؐ کیا ہے؟ انہی اوراق کی شیرازہ بندی جنہیں حوادثِ ارضی و سماوی کی آندھی کے تیز جھونکوں نے صحنِ کائنات میں ادھر ادھر بکھیر دیا تھا۔ اور

مقامِ محمدی کیا ہے؟

ان ہی درخشندہ و تابندہ ذراتِ نادرہ کا پیکرِ حسن و زیبائی کہ جن کی حقیقی آب و تاب کو ان کے ستائش گردوں کی فرطِ عقیدت کی رنگینیوں نے مستور کر رکھا تھا۔ وہاں یہ جوہر الگ الگ پڑے تھے اور یہاں یہ پیکرِ جلال و جمال ان سب کا حسین مجموعہ تھا۔ وہاں یہ الفاظ بکھرے ہوئے تھے اور یہاں یہ ایک ایسے عدیم النظیر مصرعہ میں آب و تاب سے موزوں ہو گئے تھے جو ضمیرِ کائنات میں قرنہا قرن سے پہلو بدل رہا تھا۔ وہ موتی تھے، یہ مالا تھی۔ وہ پتیاں تھیں یہ پھول تھا۔ وہ ذرے تھے، یہ چٹان تھی۔ وہ قطرے تھے یہ سمندر تھا۔ وہ ستارے تھے، یہ کہکشاں تھی۔ وہ افراد تھے، یہ ملت تھی۔ وہ نقطے تھے، یہ خطِ مستقیم تھا۔ وہ ابتدا تھی، یہ انتہا تھا۔

خلق و تقدیر و ہدایت ابتداست

رحمۃ للعالمینی انتہاست

خدائے جلیل نے اپنے بندوں سے جو کچھ کہنا تھا آخری مرتبہ کہہ دیا۔ شرفِ انسانیت کی تکمیل کے لئے جو قوانین دیئے جانے تھے وہ اپنی انتہائی شکل میں دے دیئے گئے۔ اس کے بعد انسان کو اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لئے کسی دوسری مشعلِ راہ کی ضرورت اور کسی ہادیٔ طریقت کی احتیاج نہ رہی۔ اب انسانیت کے مقامِ بلند تک پہنچنے کے لئے وہی ایک صراطِ مستقیم ہے جس پر اس ذاتِ اقدس و اعظم(۴) کے نقوشِ قدم جگمگ جگمگ کر رہے ہیں

اور جنہیں دیکھ کر ہر خبیر و بصیر پکار اٹھتا ہے کہ

مقامِ خویش اگر خواہی دریں دیر
بحق دل بند و راہِ مصطفےٰ رو

(معراجِ انسانیت صفحہ ۱۷۵)

(۴) وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدَىٰ

طلبم نہایتے آں کہ نہایتے ندارد
بہ نگاہِ ناشکیبے بہ دلِ امیدوارے

قلبِ وادیٔ فاران، یعنی ام القریٰ مکہ، اپنی تمام نگاہ فریب جاذبیتوں کے ساتھ، ہر عالمِ زاہد کے لئے مرکزِ قلب و نظر بنا ہوا ہے۔ چونکہ ریگ زارِ حجاز کے ہر ذرّہ کی عقیدت حریمِ کعبہ کے ساتھ وابستہ ہے، اس لئے طفلک و برنا و پیر، تند و دوز کاروان در کاروان اپنی پیشانیوں میں تڑپتے ہوئے سجدوں کے نذرانے لئے، رواں دواں اور کشاں کشاں اس مرجعِ انام کی طرف چلے آرہے ہیں۔ جبینِ شوق سجدوں سے معمور ہے لیکن کچھ معلوم نہیں کہ مسجود کیا ہے؟ قلبِ نیاز جذبۂ پاسِ تعبّد سے لبریز ہے لیکن کوئی نہیں جانتا کہ معبود کون ہے؟ زندگی کی تگ و تاز بہر نوع ہنگامہ خیز ہے لیکن کسی کو معلوم نہیں کہ اس تگ و تاز سے مقصود کیا ہے؟ کاروانِ حیات تیز گام ہے لیکن کوئی نہیں جانتا کہ اس کی منزل کونسی ہے؟ لیکن اس نہ جاننے کے باوجود ایک ہنگامہ ہے کہ ہر وقت برپا ہے جس میں ہر شخص اپنے آپ کو جذب کئے ہوئے ہے۔ اس کیف و مستی کے عالم میں کوئی تالیاں پیٹتا ہے، کوئی سیٹیاں بجاتا ہے۔ کوئی کعبہ کے گرد گھوم گھوم کر سفر ختم ہونے کے باوجود ذوقِ سفر کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ کوئی بتوں کے آستانوں پر جانور ذبح کر کے انکا گرم گرم لہو پی رہا ہے۔ کوئی زمزم کے کنارے بیٹھا جام و سبو کے امتیازات مٹا رہا ہے۔ کاہنوں کے گرد عورتوں کا ہجوم ہے جو صبر گریز پا اور رنجِ گراں نشیں کے جگر سوز افسانوں کا مستقبل معلوم کرنا چاہتی ہیں۔ ادھر عکاظ کے بازار میں شعرائے جادو بیاں اپنی سحر آفرینیوں سے ہر سننے والے کے دل کو اپنی مٹھی میں لئے ہوئے ہیں۔ کبھی کسی کے خاندانی مفاخر کے تذکرے سے اس کے طرۂ استکبار میں اور بالیدگی پیدا کرتے ہیں اور گاہ کسی کے عزیز کے قتل کی یاد تازہ کر کے اس کی رگوں میں آتشِ انتقام کے شعلے اس طرح بھڑکاتے ہیں کہ بزمِ شعر خوانی آن کی آن میں رزم گاہ بن جاتی ہے۔ لیکن محفلِ عیش و طرب ہے یا میدانِ

جنگ و جدل، ہر شخص پورے جذب و انہماک سے اس میں حصہ لیتا ہے اور اس ہجوم اور طنطنہ میں دنیا و مافیہا سے بے خبر یوں مستغرق ہوتا ہے کہ کوئی کشش اسے اس ہنگامے سے باہر نہیں لے جا سکتی۔ چھوٹا بڑا، امیر غریب مرد، عورت سب ان ہنگاموں میں اس طرح شریک ہیں گویا یہ چیزیں ان کی معاشرت کا جزو اور ان کی قومی زندگی کا حصہ بن چکی ہیں۔

ایک استثناء

لیکن مکہ کی ان پُر ہجوم گلیوں میں ایک شخص ایسا بھی دکھائی دیتا ہے جو ان میں سے ہوتے ہوئے بھی ان میں کا معلوم نہیں ہوتا۔ اس کی طرزِ معاشرت، وضع قطع، تراش خراش سب انہی جیسی ہے۔ وہ انہی بازاروں میں پھرتا ہے۔ انہی لوگوں کے سے کاروبار کرتا ہے۔ ان کی شادی اور غم میں شریک ہوتا ہے۔ اس کے بیوی بچے ہیں جن کی پرورش بطریقِ احسن کرتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو انہی جیسا انسان سمجھتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ اپنی زندگی میں کچھ خلا سا محسوس کرتا ہے۔ اور نہیں جانتا کہ وہ خلا کیا ہے اور کس طرح پُر ہو سکتا ہے۔ وہ مشاغل و مشارب جو اس کی قوم کا جزو زندگی بن چکے ہیں، اس کے لئے کوئی جاذبیت نہیں رکھتے۔ وہ کبھی اپنی جبینِ نیاز میں ذوقِ عبودیت کے سجودِ رقصاں لے کر حرم تک جاتا ہے لیکن وہ ان گہرہائے تابندہ کو اسی طرح واپس لے آتا ہے کہ اسے وہاں انسانوں کی بنائی ہوئی کوئی چوکھٹ اس متاعِ گراں مایہ کے شایانِ شان دکھائی نہیں دیتی۔ جب وہ انسانوں کی گردنوں کو ان کی اپنی بنائی ہوئی مٹی اور پتھر کی مورتیوں کے سامنے جھکا ہوا دیکھتا ہے، تو محوِ حیرت رہ جاتا ہے کہ ـــ یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے! وہ عکاظ کے بازار میں جب سردارانِ قریش کو اپنی عالی نسبی پر فخر کرتے دیکھتا ہے تو ہر چند وہ خود قریش کے ممتاز ترین گھرانے کا فرد ہے لیکن اس کا دل گواہی نہیں دیتا کہ جس چیز میں انسان کے اپنے اعمال کو کوئی دخل نہ ہو وہ باعثِ فخر و تکبر بھی ہو سکتی ہے۔ وہ بزمِ مے پرستی کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتا کہ اس سے اس کی فطرتِ سلیم ابا کرتی ہے۔ وہ قمار خانوں کی طرف قدم نہیں اٹھاتا کہ وہاں اسے مہذب انسانوں کے بھیس میں رہزن دکھائی دیتے ہیں۔

تلاشِ حقیقت

وہ جب ان محافل و مجالس میں اپنے لئے کوئی تسکین نہیں پاتا تو عیسائی رہبان اور یہودی احبار کی طرف رجوع کرتا ہے کہ اس نے سن رکھا ہے کہ وہ زندگی کے حقائق کا علم رکھنے کے مدعی ہیں۔ وہ خود لکھنا پڑھنا نہیں جانتا اس لئے ان علماء و مشائخ سے پوچھتا ہے کہ ان کے پاس کونسی روشنی ہے جسے وہ آسمانی کہہ کر پکارتے ہیں لیکن اسے ان مزعومہ آسمانی شمعوں پر انسانی ساخت کے ایسے ایسے فانوس نظر آتے ہیں جنہوں نے شمع کی اصل روشنی کو بالکل ڈھانپ رکھا ہے۔ وہ یہاں سے بھی

ٹھنڈی آہ بھر کر اُٹھ آتا ہے۔ اسے معلوم ہوتا ہے کہ انہی بستیوں میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو اس کی طرح ان معبودانِ باطل سے متنفر ہیں۔ وہ ان کی طرف رخ کرتا ہے کہ شاید وہیں وہ سکون مل جائے جس کی اُسے تلاش ہے۔ لیکن اسے ان کا ذوق تشنہ اور تڑپ خام نظر آتی ہے۔ وہ وہاں سے بھی مایوس واپس آتا ہے۔ غرضیکہ وہ انسانوں کے اس ہجوم میں اپنے آپ کو تنہا پاتا ہے۔ اسے کوئی ایسا دوسرا انسان نہیں ملتا جس سے اپنے دل کی تپش و خلش اور سوز و گداز کا حال کہہ سکے۔ وہ اس تنہائی سے اکتا جاتا ہے تو آسمان کی طرف آنکھ اٹھا کر پکار اٹھتا ہے کہ؎

درِیں میخانہ اے ساقی ندارم محرمے دیگر
کہ من شاید نخستیں آدمم از عالمے دیگر

تفکر و تدبر

وہ انسانوں کی بستیوں میں اپنے دل کی پکار کا کوئی جواب نہیں پاتا تو باہر فطرت کی کھلی فضاؤں میں چلا جاتا ہے۔ وہاں کبھی صحراؤں کی ناپید اکنار وسعتوں پر غور کرتا ہے اور کبھی آسمانوں کی حدود فراموش پہنائیوں پر۔ گاہ اُسے ستاروں کی تابندگی دعوتِ غور و تفکر دیتی ہے اور گاہ ماہِ عالمتاب کی درخشندگی اس کے لئے سامانِ تدبر و تفحص پیدا کرتی ہے۔ وہ مظاہرِ فطرت کی گوناگوں نیرنگیوں پر غور کرتا ہے اور بار بار اپنے دل سے سوال کرتا ہے کہ یہ عظیم الشان سلسلۂ کائنات کس طرح وجود میں آ گیا؟ کون اسے بایں حسن و خوبی چلا رہا ہے؟ اس کا بالآخر مقصد کیا ہے؟ یہ سوالات رہ رہ کر اس کے دل میں پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن اسے ان کا جواب کہیں سے نہیں ملتا۔ جب جواب نہیں ملتا تو اس سے اس کے دل کا اضطراب اور بڑھ جاتا ہے۔ اور جب اضطراب بڑھتا ہے تو اس کے ساتھ ہی تشنگیٔ ذوق کی شدت تیز سے تیز تر ہو جاتی ہے۔ لیکن اسے اپنے آپ پر ضبط اتنا ہے کہ وہ اس کا دبِّی اضطراب کو اپنے معمولاتِ زندگی پر قطعاً اثر انداز نہیں ہونے دیتا۔ وہ اپنے کاروباری معاملات، بال بچوں کی نگہداشت و پرداخت، رشتہ داروں و احباب سے میل ملاقات۔ معاشرتی زندگی کے مقتضیات میں کوئی فرق نہیں آنے دیتا۔ اور ایسی زندگی لبسر کئے جاتا ہے کہ اس کے ابنائے جنس اپنے میں اور اس میں کوئی فرق محسوس نہیں کرتے بجز اس کے کہ وہ اس کے کیریکٹر کی بلندی کے مداح ہیں۔ اور اس کی صداقت و دیانت کے معترف۔ چھوٹا بڑا سب اس کی عزت کرتے ہیں۔ قوم اور خاندان کو اس کی شرافت و اصالت پر ناز ہے۔ لیکن وہ اپنے آپ کو ان سے کچھ مختلف محسوس کرتا ہے اس لئے کہ جن گوشوں کو انہوں نے اپنے لئے وجہِ اطمینان اور موجبِ تسکین قرار دے رکھا ہے وہ ان میں سے کسی میں بھی اپنے اضطراب کا مداوا نہیں پاتا۔ وہ اپنے آپ کو ہر وقت کسی ایسی چیز کی تلاش میں مضطرب و بے قرار پاتا ہے جس کا اُسے

خود بھی علم نہیں کہ وہ کیا ہے! کارلائل کے الفاظ ہیں۔

"شروع ہی سے چلتے پھرتے آپ کے دل میں ہزاروں سوالات پیدا ہوتے تھے،

میں کیا ہوں؟

کائنات کا لامتناہی سلسلہ کیا ہے؟

زندگی کیا ہے؟

موت کیا ہے؟

مجھے کس چیز پر ایمان رکھنا چاہیئے؟

حرا اور فاران کی پہاڑیاں، ریت کے ٹیلوں کا سکوت اُن سوالات کا کوئی جواب نہیں دیتے۔ ان سوالات کا جواب کہیں سے نہیں ملتا۔ ان سوالات کا جواب انسان کی اپنی روح اور خدا کی وحی سے ملنا تھا جو اس روح کو اپنا مسکن بنالے۔

(HEROES AND HERO-WORSHIP P. 49)

ہاں اُن سوالات کا جواب کہیں سے نہیں مل سکتا۔ ان کا جواب صرف وحی کی زبان سے مل سکتا تھا۔ اور نبی قبل از نبوت وحی سے واقف نہیں ہوتا[1]۔ یہی کیفیت قبل از رسالت حضورؐ کی تھی.......

(معراج انسانیت صفحہ ۱۸۶-۱۸۸)

اس کے بعد حضورؐ شرفِ نبوت سے سرفراز فرمائے گئے۔

(۵) ہجرت (نبوت کے تیرہ سال بعد)

(مدینہ کی طرف تشریف آوری)

تین شب و روز حضورؐ نے اپنے "یارِ غار" کے ساتھ یہیں بسر کئے۔ چوتھی شب حضرت ابوبکرؓ کے گھر سے سواری کی اونٹنیاں آگئیں اور آپ آگے روانہ ہو گئے۔ مدینہ میں اطلاع پہنچ چکی تھی کہ آپؐ نے مکہ چھوڑ دیا ہے۔ تمام انصارؓ

---

[1] نبوت خالصتہً خدا کی موہبت ہوتی تھی جس میں ہونے والے نبی کے اپنے ملکہ یا کسب و ہنر کا کوئی دخل نہیں ہوتا تھا۔ خدا، جس ذات کو اس منصب جلیلہ کے لئے منتخب کر لیتا تھا اسے اپنے پروگرام کے مطابق، ایک وقتِ معینہ پر نبوت عطا کر دیتا تھا یہی وجہ تھی کہ نبی کو قبل از نبوت، وحی کا علم نہیں ہوتا تھا۔ (حضورؐ کے بعد نبوت کا سلسلہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا۔ پرویز)

وفورِ شوق و جذبۂ محبت سے سرشار صبح نور کے تڑکے بستی سے باہر آ کر دیدہ و دل فرشِ راہ کئے انتظار میں بیٹھ جاتے ہر روز صبح یہی کیفیت رہتی۔

محبوب اور ایسا جاں نواز محبوب! انتظار اور ایسا سرور آمیز انتظار! کیا وجد انگیز تھا یہ منظر!!!

قریش نے حضرتؐ کی گرفتاری پر سو اونٹ کا انعام مشتہر کر رکھا تھا۔ بریدہ اسلمیؓ ایک قبیلہ کا سردار، اس انعام کے لالچ سے حضورؐ کی تلاش میں نکلا۔ حضورؐ کو راہ میں پالیا۔ جب سامنے آیا اور ہمکلام ہوا تو اثرِ جذب کا ایک تیر تھا جو سینہ

دشمن سامنے

دل تک اتر گیا اور اپنی قوم کے ستر آدمیوں سمیت مسلمان ہو گیا۔ جوشِ مسرت سے اپنی سفید پگڑی نیزہ پر باندھ کر اس کاروانِ رشد و سعادت کے آگے آگے چل پڑا۔ پگڑی کا پھریرا ہوا میں لہراتا اور رقص انگیز انداز سے بشارتیں سناتا چلا جا رہا تھا کہ "امن کا بادشاہ، صلح کا حامی، دنیا کو انصاف و عدالت سے بھرپور کر دینے والا" آ رہا ہے۔ اس طرح رواں دواں، نور و نکہت کی ہزار دنیائیں اپنے جلو میں لئے، یہ قافلۂ جذب و سرور مدینہ کی طرف بڑھتا گیا۔ اور ۸ ربیع الاول (۲۳ ستمبر) کی صبح مدینہ کے قریب جا پہنچا۔ مشتاقین کی

مدینہ میں تشریف آوری

جماعت حسبِ معمول انتظار کے بعد واپس لوٹ چکی تھی۔ ایک یہودی نے دور سے دیکھا تو قرائن و آثار سے معلوم کر لیا کہ وہی قافلہ ہے جس کے انتظار میں اتنے دنوں سے انصار کی آنکھیں فرشِ راہ بن رہی ہیں۔ اس نے آواز دی کہ "اہلِ عرب۔ لو، جس کا تم انتظار کر رہے تھے وہ آگیا۔" تمام شہر اللہ اکبر کے نعروں سے گونج اٹھا اور انصار ہتھیاروں سے سج سج کر بیتابانہ گھروں سے نکل آئے اور پروانہ وار اس آواز کی سمت بڑھے۔ مدینہ سے تین میل کے فاصلہ پر انصار کے کچھ خاندان آباد تھے۔ اس بستی کو قبا کہتے ہیں۔ حضورؐ یہاں پہنچے تو تمام خاندان نے جوشِ مسرت میں نعرہ ہائے تکبیر بلند کئے۔ ان کے مقدر نے یاوری کی اور حضورؐ نے ان کی میزبانی قبول فرمالی۔ چودہ دن کے بعد آپ شہر کی طرف روانہ ہوئے۔ راہ میں بنی سالم کے محلہ میں جمعہ کی نماز ادا فرمائی۔ قبا سے مدینہ تک راستہ میں دو رویہ فدائیوں کی صفیں تھیں۔ سارا شہر جوشِ مسرت اور فرطِ عقیدت سے معمورۂ جذب و نشاط اور گہوارۂ حسن و بہار بن رہا تھا۔ گلی کوچوں سے تحمید و تقدیس کے نغمے اور تسبیح و تہلیل کے زمزمے ساری فضا کو کیف بار اور مسرت بیز بنا رہے تھے۔ جوشِ استقبال سے ساتگین قلوب اس طرح بے حجابا چھلک رہے تھے کہ صہبائے محبت، مسرت و ابتہاج کے نورانی آنسوؤں کی شکل میں دامان و آستین کو صحنِ گلستاں و کلبۂ باغباں بنا رہی تھی۔ کہیں وفورِ تشکر و امتنان سے جبیں ہائے نیاز بحضورِ ربِ ذوالمنن سجدہ ریز و زمین بوس تھیں۔ اور کہیں ہجومِ جذبات سے مرتعش ہاتھ تھے کہ بارگاہِ صمدیت میں اس مہمانِ عزیز کی خیر سگالی اور خوش بختی کی حسین دعائیں اور معصوم التجائیں لئے یوں جانبِ عرشِ عظیم اٹھ رہے

تھے جیسے وحشت، ساکت وخاموش میں نخیل بلند ایستادہ ہوں۔ خاکِ یثرب کے ذرات ابھر ابھر کر جبہ تن و دیدن ہوگئے تھے کہ انہیں آج اس ذات اقدس و اعظم کی کفش بوسی کی سعادت نصیب ہونے والی تھی جو تمام عالم کے لئے سرمایۂ فخر و مباہات تھی۔ چھوٹی چھوٹی لڑکیاں جوشِ مسرت میں دف بجاتیں اور یہ استقبالی نغمہ گاتی تھیں کہ

طَلَعَ الْبَدْرُ عَلَيْنَا
مِنْ ثَنِيَّاتِ الْوَدَاعِ
وَجَبَ الشُّكْرُ عَلَيْنَا
مَا دَعَا لِلّٰهِ دَاعٍ

خلوص و محبت کے ان روح پرور نظاروں میں یہ کاروانِ حسن و خوبی یثرب کی بستی میں داخل ہوا جس کا نام اس کے بعد مدینۃ النبیؐ ہوگیا۔ (معراج انسانیت۔ صفحہ ۳۲۵-۳۲۷)

(۶) حسنِ سیرت کی رعنائیاں

حیات نبویؐ کے اوراق الٹیئے اور ایک طائرانہ نگہ بازگشت ڈالئے ان تمام احوال و ظروف اور کوائف و حوادث پر جو اس داستانِ اطہر و اقدس کے اجزاء و عناصر ہیں۔ دیکھئے اور غور کیجئے کہ اس پوری داستانِ حیات میں کس طرح زندگی اپنی انتہائی تابناکیوں اور ضوفشانیوں، سرگرمیوں اور حرارت آمیزیوں، جمال آفرینیوں اور جلال انگیزیوں، سیرابیوں اور شادابیوں، کامرانیوں اور کامجوئیوں، ناپیدا کنار وسعتوں اور بے پایاں گہرائیوں کے ساتھ مصروفِ عمل نظر آتی ہے۔ زندگی نہیں، ایک کاروانِ ذوق و شوق ہے، جو یقینِ کامل اور ایمانِ محکم، حسنِ عمل اور جوششِ کردار، تطہیرِ فکر اور پاکیزگیٔ نگاہ، کشادہ ظرفی اور بلند نگہی، سوز و ساز، اور تپش و خلش کی ایک دنیا اپنے جلو میں لئے انتہائی جذب و انہماک کے ساتھ اپنی دامن کشیوں سے بے خبر اور گرد و پیش کی عناں گیریوں سے بے نیاز، اپنی متعین منزل کی طرف مستانہ وار بڑھے چلا جا رہا ہے۔ نہ راستہ کے خطرات اس کے دل میں خوف و خطر پیدا کرتے ہیں۔ نہ سفر کی صعوبات اس کے پائے استقامت میں لغزش کے آثار نمودار کرتی ہیں۔ گوئٹے کے الفاظ میں زندگی نہیں، ایک جوئے رواں ہے کہ نامساعدتِ حالات و ناموافقتِ زمانہ کی ہر چٹان اس کی رفتار میں اور تیزی اور اس کی موجوں میں مزید خوش خرامی پیدا کر دیتی ہے۔

بنگر کہ جوئے آب چہ مستانہ می رود
مانندِ کہکشاں بگریبانِ مرغزار

در خوابِ ناز بود بہ گہوارۂ سحاب　　　وا کرد چشمِ شوق بہ آغوشِ کوہسار

از سنگ ریزہ نغمہ کشاید خرامِ او　　　سیمائے او چوں آئینہ بے رنگ و بے غبار

زی بحرِ بیکرانہ چہ مستانہ می رود

در خود یگانہ، از ہمہ بیگانہ می رود

یہ جوئے رواں نہ صرف ہجومِ تزاحم اور انبوہ تصادم کی سنگلاخ زمینوں ہی سے مستانہ وار گزرتی آئی ہے بلکہ کشش و جاذبیت کی ہر وادیٔ رنگ و تعطر اور امیال و عواطف کے ہر دامنِ کیف و نکہت پر ایک نگہِ تبسم ڈالتی، کج کلاہانہ انداز سے آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔

در راہِ او بہار پری خانہ آفرید　　　نرگس دمید و لالہ دمید و سمن دمید

گل عشوہ داد و گفت یکے پیشِ ما بایست　　　خندید غنچہ و سرِ دامانِ او کشید

ناآشنائے جلوہ فروشانِ سبزپوش　　　صحرا برید و سینۂ کوہ و کمر درید

زی بحرِ بیکرانہ چہ مستانہ می رود

در خود یگانہ، از ہمہ بیگانہ می رود

(معراجِ انسانیت۔ صفحہ ۶۶۱ - ۶۶۲)

(۷) مقامِ محمودیت ۔ (آخری باب)

دنیائے انسانیت میں آج جو کچھ قابلِ حمد و ستائش اور درخورِ تحسین و تبریک نظر آتا ہے وہ اسی وجہ سے ہے کہ وہ بالواسطہ یا بلاواسطہ ایک نسبت رکھتا ہے ذاتِ محمدؐ رسول اللہ سے اور جو انسان چاہتا ہے کہ وہ درخورِ حمد و ستائش ہو جائے، وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر اسی کوشش میں ہے کہ اس راستہ پر چل نکلے جو سیرتِ محمدیہ نے دنیا میں متعین کر کے دکھایا۔

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بو

آنکہ از خاکش بروید آرزو

یا ز نورِ مصطفیٰؐ اورا بہاست

یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰؐ است

آج محفلِ کائنات میں کوئی شمع جلوہ فگن نہیں جو اس سراج منیر سے کسبِ ضیاء نہ کررہی ہو۔ اس تیرہ سو سال کی تاریخ پر نگاہ ڈالئے اور پھر دیکھئے کہ دنیا آہستہ آہستہ اسی نظام کی طرف آرہی ہے یا نہیں جو محمد رسول اللہؐ والذین معہ نے اس دنیا میں متشکل کرکے دکھایا تھا۔ دیکھئے کہ اس عرصے میں جس قدر انقلابات دنیا میں آئے اور جنہیں دنیا نے نوعِ انسانی کے لئے موجبِ خیر و برکت قرار دیا ان کا سرچشمہ کہاں تھا؟

(معراجِ انسانیت ۔ صفحہ ۷۸۷ ۔ ۷۸۸)

انسانیت کے معراجِ کبریٰ اور شرفِ اعلیٰ کا یہی وہ مقام ہے جس کے پیشِ نظر خدا اور اس کے فرشتے اس ذاتِ گرامی کو مستحقِ ہزار تحسین و تبریک قرار دیتے ہیں۔

إِنَّ اللَّهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ ۚ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا صَلُّوا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ﴿۳۳/۵۶﴾

گہرھائے تابدار

(چند احادیثِ مقدسہ جو طلوعِ اسلام کے ٹائیٹل پر وقتاً فوقتاً شائع ہوتی رہیں)

○ رسول اللہؐ نے وفات کے وقت کچھ نہیں چھوڑا۔ نہ درہم نہ دینار۔ نہ غلام نہ لونڈی۔ نہ کوئی اور شے۔ صرف اپنا سفید خچر اور ہتھیار۔ اور کچھ زمین جسے عام مسلمانوں کے لئے چھوڑ دیا۔

(بخاری)

○ رسول اللہؐ نے فرمایا ۔۔۔ ہمارا کوئی وارث نہیں۔ جو چھوڑا ہے وہ عام مسلمانوں کے لئے ہے۔

(بخاری)

○ حضرت علیؓ کی روایت ہے کہ ۔۔۔۔ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ

خبردار فتنہ واقع ہوگا۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہؐ اس سے کیونکر نجات ہوگی؟ آپ نے فرمایا کہ کتاب اللہ پر عمل کرنے سے۔ جس میں تمہارے درمیان (حرام و حلال یا طاعت و گناہ وغیرہ کا)

حکم ہے۔ اور حق و باطل کے اندر قول فیصل ہے۔ جس متکبر نے قرآن کو چھوڑا ہلاک کرے گا اس کو اللہ جس نے قرآن کی طرف لوگوں کو بلایا۔۔ اس کو سیدھی راہ دکھائی گئی۔

(مشکوٰۃ بحوالہ ترمذی - دارمی)

- رسول اللہؐ نے فرمایا کہ میرے بعد تم سے بہت سی احادیث بیان کی جائیں گی۔ سو جب کوئی حدیث میری طرف سے بیان کی جائے تو اسے کتاب اللہ کے سامنے پیش کرو۔ جو اس کے موافق ہو اسے قبول کر لو۔ جو اس کے خلاف ہو اسے رد کر دو۔ (بحوالہ کتاب التوضیح والتلویح صفحہ ۴۸۰)

- رسول اللہؐ نے فرمایا کہ زمین اللہ کی ہے اور بندے بھی اللہ ہی کے ہیں۔ اس لئے زمین اللہ کے بندوں کے لئے رہنی چاہیئے۔ کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہونی چاہیئے۔ (کتاب الاموال)

- (امام بخاریؒ) عبدالعزیز بن رفیعؒ سے روایت کرتے ہیں کہ میں اور شداد بن معقلؒ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ پھر شداد بن معقل نے ان سے دریافت کیا "کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی چیز چھوڑی تھی؟" انہوں نے جواب دیا "آپ نے مابین الدفتین (یعنی مجلد قرآن مجید) کے علاوہ کچھ نہیں چھوڑا" عبدالعزیز بن رفیعؒ کہتے ہیں کہ پھر ہم دونوں محمد بن الحنفیہؒ کی خدمت میں پہنچے۔ اور ان سے بھی یہی بات دریافت کی۔ انہوں نے کہا "آپ نے مابین الدفتین کے علاوہ کچھ بھی نہیں چھوڑا"

(صحیح البخاری - جلد سوم صفحہ ۱۴۳ - مطبوعہ مجتبائیہ مصریہ)

- رسول اللہؐ نے فرمایا۔۔ میرے ورثا میں ایک دینار بھی بطور ترکہ تقسیم نہ ہوگا۔ میری بیویوں کی ضروریات اور منتظم کی خوراک کے بعد جو کچھ بھی بچے وہ صدقہ ہوگا۔ (بخاری جلد ۲ - کتاب الغرائض)

- رسول اللہؐ نے اپنے آخری حج کے خطبہ میں فرمایا۔۔ میں تم میں ایک ایسی چیز چھوڑے جاتا ہوں جس سے اگر تم وابستہ رہے تو کبھی گمراہ نہیں ہو گے۔۔ وہ چیز کتاب اللہ ہے۔

(مسلم - نسائی - ابوداؤد)

- حضرت ابوموسیٰؓ سے روایت ہے کہ اشعر کے قبیلہ والوں کے ہاں یہ دستور تھا کہ جب کسی جنگ میں ان کے پاس کھانا تھوڑا رہ جاتا یا مدینہ میں ان کے بال بچوں پر فاقہ کی نوبت آجاتی تو یہ لوگ سب اپنے اپنے کھانوں کی چیزوں کو ایک جگہ جمع کر لیتے۔ اور ایک برتن میں برابر حصے لگا کر آپس میں تقسیم کر لیتے۔

رسول اللہؐ نے فرمایا کہ یہ لوگ مجھ سے ہیں اور میں ان سے ہوں۔

(بخاری - مسلم)

○ حضرت ابو سعید خدری رضؓ سے روایت ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سفر میں تھے۔ ایک شخص آیا اور دائیں بائیں دیکھنے لگا۔ آپؐ نے فرمایا جس کے پاس سواری ضرورت سے زیادہ ہو وہ اس شخص کو دیدے جسے اس کی ضرورت ہو۔ جس کے پاس زادِ راہ ضرورت سے زیادہ ہو وہ اسے دیدے جس کے پاس نہ ہو۔ اس طرح آپؐ نے بہت سی چیزوں کا ذکر فرمایا۔ حتیٰ کہ ہم نے سمجھ لیا کہ ہم میں سے کسی کو ضرورت سے زیادہ کوئی چیز..... رکھنے کا حق نہیں۔

(مسلم بحوالہ ریاض الصالحین امام نوویؒ)

○ فرمایا رسول اللہ ﷺ نے کہ ہر نبی کو بقدر ان لوگوں کے جو اس پر ایمان لائے، معجزے دیئے گئے لیکن میرا معجزہ تو وحی (قرآن) ہے جو خدا نے مجھ پر بھیجی ہے۔ (چونکہ یہ معجزہ دائمی اور تمام نوع انسانی کے لئے ہے) اس لئے مجھے امید ہے کہ سب انبیاء سے زیادہ قیامت کے روز میری امت ہوگی۔

(بخاری جلد سوم۔ باب فضائل القرآن)

○ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اگر تم پر کوئی ایسا حبشی غلام بھی، جس کا سر کشمش کی طرح چھوٹا ہو، امیر بنا دیا جائے، تو جب تک وہ کتاب اللہ کے مطابق چلائے اس کی سنو اور اس کی اطاعت کرو۔

(بخاری)

○ فرمایا کہ مجھ سے (قرآن کے علاوہ) کوئی بات نہ لکھو اور جس نے قرآن کے علاوہ کچھ اور لکھ لیا ہو وہ اسے مٹا ڈالے۔

○ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ جس بستی میں کسی شخص نے اس حال میں صبح کی کہ وہ رات بھر بھوکا رہا اس بستی کی حفاظت و نگرانی کا ذمہ ختم ہوا۔

(مسند امام احمد)

پاکستان اور اسلامی کلچر

(پروفیسر شمیم انور صاحب (ایم۔اے) نے طلوعِ اسلام کی سابقہ کنونشن میں، عنوانِ بالا پر انگریزی میں تقریر کی، جسے پمفلٹ کی شکل میں شائع کر دیا گیا تھا۔ اس تقریر کا آزاد ترجمہ درج ذیل ہے۔ طلوعِ اسلام)

پاکستان کا قیام تاریخِ انسانی کا ایک انوکھا باب ہے اور اسے حالات کی کرشمہ سازی سمجھئے کہ اپنوں اور بیگانوں کی غداریوں، سازشوں، ریشہ دوانیوں اور ناپاک گٹھ جوڑ کے باوجود یہ مملکت ہر نوع ارتقائی مراحل طے کر رہی ہے۔ لیکن اس عجیب و غریب حقیقت کا ایک اور پہلو بھی ہے جو اس سے بھی کہیں بڑھ کر حیرت انگیز ہے اور وہ یہ کہ چودہ سال کا عرصہ گذر جانے کے باوجود، یہ پوچھا جاتا ہے کہ اس مملکت کے قیام سے بالآخر مقصد کیا تھا؟ یہ کیوں معرضِ وجود میں لائی گئی تھی؟ نہ صرف اندرونِ ملک میں، بلکہ غیر ممالک میں سفر کرتے ہوئے، پاکستانیوں کو اس استفسار سے دوچار ہونا پڑتا ہے کہ اس جداگانہ مملکت کے قیام کی ضرورت کیا تھی؟ پچھلے دنوں ایک جرمن صحافی کی کتاب کا مطالعہ کرتے ہوئے میرے سامنے بھی یہ سوال ابھر کر آگیا ——— مصنف نے براہ راست پاکستان کے وزیر خارجہ سے یہ سوال کیا تھا کہ وہ کونسے تعلقے تھے جو حصولِ پاکستان کا محرک ثابت ہوئے۔

لمحۂ فکریہ یاد رکھئے کہ اس اہم سوال کو ازراہِ تفنن ٹالا نہیں جا سکتا بلکہ ہمیں اس پر سنجیدگی سے غور و فکر کرنا پڑیگا۔ پاکستان، بہرحال ان آزاد اور خود مختار مملکتوں میں سے ایک مملکت ہے جو ایشیا اور افریقہ کی وسعتوں میں ابھر ابھر کر سامنے آئی ہیں۔ ان سب کی تحریک آزادی ان ممالک کا جائز حق قرار پائی ہے اور اسی اعتبار سے یہاں کے عوام کی ان کاوشوں کو خراجِ تحسین پیش کیا گیا۔ عصرِ حاضر کی جمہوری

فضاؤں میں بدترین سامراجی قوتیں بھی اپنے گھناؤنے مقاصد کو بلند بانگ اور مقدس نعروں کے دلفریب نقاب میں چھپانے پر مجبور ہو گئی ہیں۔ اور آپ دیکھیں گے کہ اپنی سامراجی گرفت کو مضبوط رکھنے کے لئے وہ کبھی یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ اپنی محکوم قوم کو حکومتِ خود اختیاری کی تربیت دے رہے ہیں۔ کہیں بین الاقوامی ضابطوں کی آڑ میں اپنی ہوسناکیوں کی وجہ جواز پیدا کی جاتی ہے۔ کہیں نسلی تعصبات کے ساتھ سامراجی منصوبوں کی بجاآوری کا امکان پیدا کیا جاتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اب دنیا میں جمہوری انقلاب آچکا ہے اور کسی قوم کو بزور غلام نہیں رکھا جا سکتا لیکن اس روشن حقیقت کے باوجود ہمیں اس سوال سے عہدہ برا ہونا پڑے گا کہ

تشکیل پاکستان کی وجہ جواز کیا تھی؟

میں چاہتی ہوں کہ اس مسئلہ کے بارے میں جو کچھ میں نے سوچا اور تجزیہ کیا ہے اُسے حاضرین کے سامنے پیش کر دوں۔ اپنی معلومات سے متعلق میں کوئی بلند دعویٰ نہیں کرتی۔ ہو سکتا ہے کہ میرا یہ تجزیہ آپ حضرات کے نزدیک ناقص اور نامکمل قرار پائے۔ تاہم میں سمجھتی ہوں کہ اگر میں نے آپ کو کم از کم اس اہم مسئلے کے بارے میں آمادۂ فکر کر دیا تو اس سے میرا مقصد پورا ہو جائے گا۔

اسلامی کلچر کا انوکھا مفہوم

ایک پاکستانی سے جب یہ سوال کیا جاتا ہے کہ پاکستان کیوں معرضِ وجود میں آیا تو ادنیٰ ہچکچاہٹ کے بغیر عموماً وہ جھٹ سے یہ کہہ دیتا ہے کہ "اسلامی کلچر کے تحفظ کے لئے"۔ لیکن جب اس سے اسلامی کلچر کا مفہوم اور وضاحت طلب کی جائے گی تو وہ بغلیں جھانکنے لگ جائے گا یقین کیجئے کہ یہ الجھن ہماری خود پیدا کردہ ہے اور اس کی وجہ "کلچر" کا وہ غلط تصور ہے جو ہم نے اپنے ذہنوں میں پیدا کر رکھا ہے۔ ہم یہ دعویٰ لے کر اٹھے تھے کہ ایک متحدہ مملکت میں ہندو و مسلم دو مختلف کلچر باہم گزشو و نما نہیں پا سکتے۔ اس لئے برصغیر ہند کی تقسیم ناگزیر ہے۔ یہاں تک معاملہ صاف تھا لیکن اس سے ایک قدم آگے بڑھ کر جب ہم اسلامی اور پاکستانی کلچر کا مفہوم اور اس کی وضاحت بیان کرنے لگتے ہیں تو بات الجھ کر رہ جاتی ہے۔ اس سلسلے میں خواہ (The Culture of Pakistan) کے موضوع پر احمد علی صاحب کی قلم آرائیاں ہوں یا ایس۔ ایم۔ اکرام اور دیگر مصنفین کی خامہ فرسائیاں اسلامی کلچر کی تفصیلات لے دے کر ان گنبدوں اور میناروں میں سمٹ کر رہ جاتی ہیں جن کا شاہکار تاج محل قرار دیا جاتا ہے۔ پھر عربی حرف تہجی کی اردو زبان میں ارتقا پذیری اور علاقائی زبانوں میں ہیر رانجھا اور سسی پنوں کے سہانے گیت عہدِ رفتہ کا ثقافتی سرمایہ بن کر سامنے آتے ہیں۔ لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد، شاہنامہ

اور الف لیلیٰ کی داستانیں اور مزید برآں غزل، قصیدہ، امیر خسرو کی قوالی اور ستار کی روایات سب اسی ثقافتی ورثہ کا بیش بہا سرمایہ سمجھی جاتی ہیں۔

اسلامی کلچر کے ان مظاہر میں صوفیائے کرام اور اولیائے عظام کی صفیں بھی آراستہ نظر آئیں گی۔ مغلیہ دور کا فن تصویر کشی، ملتان اور بہاولپور کی کوزہ گری۔ ڈھاکہ کی ململ کشمیر کے قالین، لکڑی اور دھات کا کام اور پیپر مشی وغیرہ سب کے سب اسی اسلامی کلچر کی متاع عزیز قرار پا چکے ہیں۔

معاملہ یہیں پر ختم نہیں ہوتا آگے بڑھئے! کوئی چار سال کا عرصہ ہوا امریکہ کی مشی گن یونیورسٹی میں اسلامی آرٹ کے ریسرچ پروفیسر ڈاکٹر رچرڈ ایتھنگ ہین سن (Dr. RICHARDEITHINC HANSEN) مذاکرہ اسلامی (ISLAMIC COLLOQUIM) (منعقدہ لاہور) میں ہمیں یہ بتانے کے لئے تشریف لائے تھے کہ اسلامی آرٹ کیا ہے؟ ——— جی ہاں! ہم اپنے ہاں دریاؤں کے بند تعمیر کرنے کے لئے ہی غیر ملکی ماہرین کی خدمات حاصل نہیں کرتے بلکہ انھیں اس لئے بھی دعوت دی جاتی ہے کہ وہ آئیں اور ہمیں یہ بتائیں کہ اسلام کیا ہے اور ہمارا مقصد حیات کیا ہونا چاہیئے؟ اب سنئے کہ انھوں نے یہاں کیا گوہر فشانی فرمائی۔ "اسلامی آرٹ مخصوص ہے۔ طاق۔ چراغ۔ عربی حروف تہجی اور کتابوں کی آرائش نگاری سے" یہ تھا اسلامی آرٹ کی وضاحت میں ان کا ارشاد گرامی! اب سوچئے کہ کیا یہی تھا وہ "اسلامی کلچر" جس کے تحفظ کے لئے ہم نے اپنی جداگانہ اور آزاد مملکت کی تشکیل کی؟ اس قسم کی موشگافیوں سے جو ذہنی تضاد اور الجھنیں پیدا ہوتی ہیں ان کا اندازہ شہریت (CIUICS) کی ایک کتاب سے، جو ہمارے ہاں نئی نسل کے درسی نصاب میں شامل ہے، بخوبی ہو سکے گا۔ میں اس کتاب سے چند اقتباسات آپ کے سامنے لا رہی ہوں۔ مختلف ثقافتوں (CULTURES) کے باہمی تصادم پر بحث کرتے ہوئے مصنف لکھتا ہے:-

متضاد ثقافتوں کا تصادم

"ہر وہ خطۂ زمین، جہاں دو مختلف اور متضاد نظام ہائے زندگی ایک دوسرے کے مقابل صف آرا ہوں لازماً دو ثقافتوں (CULTURES) کے باہمی ٹکراؤ کی رزمگاہ بنے گا۔ اور یہ حقیقت ہے کہ اس طرح ایک کلچر کا احیاء وارتقاء دوسرے کلچر کے لئے سامان موت ثابت ہوگا۔ ہماری اپنی داستانِ حیات اسی حقیقت کی جیتی جاگتی مثال ہے۔ برصغیر ہند کے ہندو اور مسلمان دو مختلف اور واضح ثقافتوں (CULTJRES) کے حامل تھے۔ ان کے لئے نہ تو مل جل کر زندگی بسر کرنا ممکن تھا اور نہ وہ ایک دوسرے کے وجود کو گوارا کرنے کے لئے تیار تھے۔ یہ چپقلش اس حد تک بڑھی کہ ہندوستان کی تقسیم ناگزیر صورت اختیار کر گئی۔ اور یہ اشد ضروری سمجھا گیا کہ ہر دو کلچرز کو الگ الگ خطوں میں نشوونما پانے کے مواقع حاصل ہوں۔

چند سطور آگے بڑھ کر یہ مصنف ثقافتی تضاد کا منظر سامنے لاتا ہے اور اس پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

غور کیجئے کہ ایک شخص دو مختلف ثقافتوں سے دوچار ہے۔ وہ نہیں جانتا کہ کونسی راہ اختیار کرے۔ اس کی پوری زندگی منتشر اور زیر و زبر ہو کر رہ جائے گی۔

اس نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے مصنف نے تعلیم یافتہ شہری طبقہ کی "موزوں ترین تصویر" پیش کی ہے۔ اور اس کے بعد وہ لکھتا ہے۔

دو متضاد ثقافتی سانچوں میں ہماری زندگی زیر و زبر ہو کر رہ گئی ہے۔ مشرق و مغرب کے وجود اگانہ تصورِ حیات ہمیں اپنی گرفت میں لئے ہوئے ہیں۔ ہم اپنے دفتروں، کالجوں اور ریستورانوں میں انگریزی زبان سے لو لگائے ہوتے ہیں۔ اور گھروں کی چار دیواری میں اردو یا کسی دوسری علاقائی زبان سے کام لیتے ہیں۔ گھروں میں ہم اپنا ملکی لباس استعمال کرتے ہیں اور گھروں سے باہر ہم اکثر مغربی لباس میں ملبوس ہوتے ہیں۔ ہماری اقدارِ حیات مشرق و مغرب کا معجون مرکب سا بن گئی ہیں۔ ہمارے رجحانات بنیادی طور پر کٹر قسم کے مشرقی ہیں لیکن ان کی نمود و نمائش مغربی آب و تاب کی رہینِ منت ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارا اپنا کوئی مخصوص کلچر نہیں رہا۔ اور اگر کوئی ہے تو وہ ہماری شخصیت کا کا آئینہ دار قطعاً نہیں۔ اس کے انداز و ترتیب میں کوئی نکھار موجود نہیں۔

اس کے باوجود مصنف نے کہا ہے کہ ہم نے پاکستان اس لئے حاصل کیا تھا کہ ہمارا "کلچر" واضح طور پر ہندوؤں سے مختلف اور جداگانہ تھا۔ ایک طرف یہ کہا جاتا ہے کہ ہمارا اپنا کلچر ہی کوئی نہیں رہا۔ اور دوسری طرف یہ سنایا جاتا ہے کہ ہم نے پاکستان اس لئے حاصل کیا تھا کہ ہمارا مخصوص کلچر محفوظ رہے۔ یہ چہ بوالعجبی ست؟

ایک اور الجھاؤ یہ الجھاؤ اسی مرحلہ پر ختم نہیں ہوتا بلکہ اس کا سلسلہ آگے بڑھتا ہے۔ یہ اس لئے کہ ہم میں سے اکثر نے کلچر اور تہذیب (CIVILISATION) کی اصطلاحوں میں ایک الجھاؤ پیدا کر رکھا ہے۔ چنانچہ ایک مصنف نے لکھا ہے کہ "مغربی پاکستان کی سرزمین کتنی ہی ثقافتوں (CULTURES) کا نشیمن قرار پائی ہے۔ یہ مختلف کلچرز وادیٔ سندھ کی تہذیب، ایران و یونان کے اثرات، ساکا اور کشن اقوام کے تسلط اور ترک و افغان اور مغلیہ دور کی کارفرمائیوں پر مشتمل ہیں۔ لاریب کہ پاکستان نوزائید ملکت ہے لیکن وہ عہدِ رفتہ کے پانچ ہزار سال پرانے کلچر کا وارث ہے۔ اس کلچر کے نشانات آج بھی موہنجوداڑو کی کسی گمنام رقاصہ کے مجسمے کی صورت میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ علاوہ بریں وادیٔ سندھ کی چھوٹی چھوٹی خوبصورت تختیوں کے وہ

نقوش بھی اس کی نشان دہی کریں گے جن کی تحریریں آج بمشکل پڑھی جا سکتی ہیں۔ تاریخی اعتبار سے ان کی عمر سندھ میں عربوں کی ان فتوحات سے بہت زیادہ ہے جن کی کوئی شایانِ شان یادگار آج نظر نہیں آتی۔"

یہ ابھاؤ کیوں؟ جہاں تک میں سمجھ سکی ہوں اس سلسلے میں ہماری ذہنی الجھنوں، انتشار اور ناپختگی کا ایک اہم سبب تہذیب اور کلچر کی اصطلاحوں کے غلط مفہوم پر مبنی ہے۔ ہم اس کا کافی خمیازہ بھگت چکے ہیں اور صورتِ حال کا تقاضا ہے کہ ہم انتہائی سنجیدگی سے اس مسئلہ پر غور و خوض کریں۔

اصولی نقطۂ نظر سے، کسی قوم کے کلچر سے مراد اس کا ذہنی رجحان ہوتا ہے۔ کلچر کا نام ہے اس تصور کا جو قلوب و اذہان کی گہرائیوں میں کارفرما ہوتا ہے۔ اس سے نہ صرف افرادِ مملکت کی زندگی میں جوش کردار کے چشمے پھوٹتے ہیں بلکہ ان کا منظم زندگی مخصوص سانچوں میں ڈھلتا ہے۔ ایک کلچر کی کسی دوسرے کلچر میں تبدیلی دراصل اس داخلی انقلاب کی آئینہ دار ہوتی ہے جو افراد کے قلب و نگاہ کی گہرائیوں میں پھوٹتا ہے۔ یہ عظیم تبدیلی افراد معاشرہ کے انداز فکر میں بنیادی تغیرات کی مظہر ہوتی ہے۔ وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ بدلتے ہوئے رسوم و رواج اور عادات کو کلچر کی اصطلاح سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔

کلچر اور تہذیب کا فرق ڈاکٹر سید عبداللطیف نے ان دونوں کے فرق کو بڑے صاف اور واشگاف انداز میں واضح کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "ہر اس معاشرے میں جہاں حقیقی مفہوم کے اعتبار سے، اس حقیقت کو سمجھا نہیں گیا وہاں کلچر کی اصطلاح ہمیشہ تہذیب کے مفہوم سے ابھادی گئی۔ اس سطحی اور عام نقطۂ نظر سے کلچر کی اصطلاح کا مفہوم "ہر دور کا فیشن" قرار پا گیا ——— بالخصوص زندگی کے ظواہر میں جیسے لباس کی تراش خراش، طرزِ رہائش میں آرائش و تزئین، مادی ضروریات زندگی میں نمود و نمائش جسمانی آسائش و تفریح کے ساز و سامان اور اس قسم کے دیگر نمائشی لوازمات۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ اس قسم کا ظاہری رکھ رکھاؤ اور زیبائش، قلب و نگاہ کی اس پاکیزگی کا آئینہ دار بھی ہو جو ایک حقیقی کلچر کی نمایاں خوبی قرار پاتی ہے۔ بقول ہیملٹ "ایک انسان دلآویز مسکراہٹوں کے باوجود خبث باطن کا حامل بھی تو ہو سکتا ہے"۔ اس سے ڈاکٹر صاحب کا مقصود یہ واضح کرنا ہے کہ وہ کون کون سی چیزیں ہیں جنھیں کلچر کے مفہوم میں نہیں لانا چاہیئے

اس وضاحت کی روشنی میں کلچر نام ہے قلب و نگاہ کی لطافت و نظافت کا، نہ کہ زندگی کی ظاہری نمائش اور اضافی کیفیات کا۔ کلچر کی وضاحت کے لئے سپنگلر OSWALD SPENGLER "روح" کا لفظ استعمال کرتا ہے۔ اس کی مزید توضیح کے طور پر وہ لکھتا ہے کہ "ہر کلچر اپنی ایک تہذیب رکھتا ہے اور تہذیب ان خارجی اور

اضافی کیفیات کا نام ہے جس کی صلاحیت ہر ارتقا پذیر معاشرے میں پائی جاتی ہے۔" یہ ہے کلچر اور تہذیب کا باہمی تعلق۔ ایک روح ہے تو دوسرا شعور۔ ایک کا مظہر یونان ہے تو دوسرے کا آئینہ دار روم۔

کلچر ہے کیا؟ کلچر وہ تخلیقی عمل ہے، جس کی نمود تہذیب کے رنگ میں ہوتی ہے یعنی معاشرتی، اقتصادی اور سیاسی تربیت گاہیں، فنون لطیفہ، سائنسی انکشافات و ایجادات، سب اس کے نشوونما کے وسائل قرار پاتے ہیں۔ کلچر کے ان مظاہروں کا کوئی مشترک نام نہیں۔ یہ مختلف النوع اور جداگانہ حیثیتوں کے حامل ہوتے ہیں اور وقت کی رفتار کے ساتھ بدلتے اور ارتقا پذیر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ بالفاظ دیگر ایک مخصوص کلچر کی نمود مختلف النوع تہذیبوں کے پیکروں میں ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر گنبد و مینار، غزل اور قصیدہ اسلامی کلچر کی اجارہ داری نہیں کہلا سکتے۔ اس کا مظاہرہ دوسری قسم کی عمارات اور دیگر اندازِ تحریر و تقریر میں بھی ممکن ہے۔ سوچئے کہ اگر تمام تہذیبیں ایک ہی سانچے میں ڈھل گئی ہوتیں تو یہ عالم رنگ و بو کس قدر خشک اور بے کیف سا ہو کر رہ جاتا۔ زندگی کا حسن و جمال گلہائے رنگا رنگ کا رہینِ منت ہے۔ اور جس قدر یہ تنوع زیادہ ہوگا زندگی اسی قدر رنگینیوں سے مالا مال نظر آئے گی۔ اگر ساری دنیا ایک ہی کلچر کی بنا لے تو بھی قوسِ قزح کی طرح ہر جگہ مقامی رنگینیوں کو محفوظ رکھنا ضروری ہو جائے گا۔ ارنسٹ کیشیرر نے اپنی کتاب (ESSAY ON MAN) میں کس قدر درست کہا ہے کہ "اس معاملے میں ہم وحدتِ اثرات کے طلب گار نہیں بلکہ وحدتِ عمل کے متلاشی ہیں۔ ہمارا مقصود اپنی کاوشوں کے ماحصل کی وحدت نہیں بلکہ عمل تخلیق کی وحدت ہے۔ اگر "آدمیت" کی اصطلاح کوئی متعین مفہوم رکھتی ہے تو وہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ تمام اختلافات و تضادات جو اس کے اندر مختلف اشکال میں پائے جاتے ہیں، یہ سب ایک ہی مشترک انجام کے لئے سرگرم کار ہیں۔" لہٰذا اگر پاکستانی انگریزی یا چینی زبان میں گفتگو کرتے ہیں یا امریکن طرزِ تعمیر کو اپناتے ہیں یا مغربی لباس اختیار کرتے ہیں تو اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا غلط ہوگا کہ ہم سفرِ زندگی میں کسی ثقافتی دوراہے پر سرگرداں کھڑے ہیں۔ اگر بلبل چودھری اور رام گوپال کے رقص میں مماثلت پائی جاتی ہے۔ اگر روشن آرا اور ہیرا بردو کر کی موسیقی میں کوئی فرق نمایاں نہیں تو اس کا یہ مطلب کیوں ہو کہ پاکستان کو زندہ رہنے کا حق ہی حاصل نہیں۔ خود قرآن صاف اور واشگاف الفاظ میں یہ اعلان کر رہا ہے کہ زبانوں اور رنگوں کا اختلاف خدا کی آیات (نشانیوں) میں سے ہے۔ اشیائے کائنات کے نظم و ترتیب میں بھی ایک تنوع پایا جاتا ہے۔ جب نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے مکہ سے مدینہ کو ہجرت کی تھی تو اس کی وجہ یہ ہرگز نہ تھی کہ حضورؐ نے اہلِ مکہ سے مختلف زبان یا عادات و

خصائل اختیار کیے تھے بلکہ یہ اس لئے ہوا کہ حضورؐ فکر و نظر کے ایک نئے انقلاب کے داعی بن کر میدان میں آئے تھے۔ نبی اکرمؐ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ نے ایک نئے کلچر کو متشکل کیا تھا۔ آخر یہ کلچر تھا کیا؟ ہاں یہ کلچر تقاضائے حیات کو لبیک کہنے کی دعوت تھی۔ یہ کلچر آدم کو وہ مقام بلند عطا کرنے آیا تھا جہاں کائناتی قوتیں (ملائکہ) اس کے حضور سجدہ ریز ہو جاتی ہیں۔ یہی ہے وہ کلچر جو انسان کو خدا کی رفاقت کا منصب عطا کرتا ہے۔ یہ وہ روح ہے جو انسان کو تگ و تاز حیات اور مہمات زندگی کے لئے ابھارتی ہے۔ یہ علم و تحقیق کی ایک سیمابی تڑپ ہے اور انسانی شعور کا وہ حیرت انگیز تجسس جو اسے قوانین فطرت کی نقاب کشائی کے لئے طلسم پیچ و تاب بنا دیتا ہے۔ یہ اس حسین و جمیل حیرت کدۂ عالم میں زندگی بسر کرنے کا بے پایاں جذبۂ مسرت ہے جو نوع انسانی کو لامحدود ممکنات زندگی سے دوچار کرتا ہے۔ یہی نشان منزل ہے جو لامحدود وسائل زندگی کی نقاب کشائی، اشیائے فطرت کی تسخیر اور جنت ارضی کے قیام کے ولولوں اور امنگوں کو سوئے منزل رواں دواں بڑھائے چلا جاتا ہے۔ یہ ایک تخلیقی جوشش کردار ہے جس کی بدولت انسانی صلاحیتیں نشو نما پائے چلی جاتی ہیں۔ جب انسان اس کلچر کو اپنے قلب و نگاہ کی گہرائیوں میں سمو لیتا ہے تو پھر اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ کوئی مہم ایسی نہیں ہوتی جو ناقابل تسخیر ہو۔ کوئی منزل ایسی نہیں ہوتی جسے دشوار گذار سمجھا جائے۔ کوئی چیلنج نہیں ہوتا جس کا منہ توڑ جواب نہ دیا جا سکے۔ یہی جذبہ تھا جس کی بنا پر طارق نے اندلس کے ساحل پر اپنے سفینے نذر آتش کر دیئے تھے۔ یہی وہ روح تھی جس نے اہل یورپ کو نئی دنیا کی تسخیر کے لئے سرگرم تگ و تاز کیا تھا۔ امریکہ کی وہ سرزمین جہاں پہلے گھنے جنگل چاروں طرف پھیلے ہوئے تھے۔ جہاں جنگلی درندوں کا ہر چہار اطراف دور دورہ تھا جہاں تند و تیز دریا طوفان مچائے ہوئے تھے۔ وہی سرزمین آج تہذیب و تمدن کا گہوارہ ہے۔ امریکہ کی یہ صبح انقلاب آسمانی دیوتاؤں کی کرشمہ سازی ہرگز نہ تھی بلکہ یہ سب کچھ عام انسانوں کی سعی مشکور کا نتیجہ ہے۔ یہی وہ روح تھی جو آج مملکت روس کے طول و عرض میں کارفرما ہے۔ وہی روس جہاں کل تک جمود اور بے حسی کا دور دورہ تھا آج اقوام عالم میں ایک عظیم ترین قوت کا درجہ حاصل کر چکا ہے۔ انسان نے جہاں جہاں زندگی کے تقاضوں کو دعوت دے کر بلایا اور مردانہ وار ان کا مقابلہ کیا ہے، وہ سب اسی جذبہ کی نمود ہے جسے قرآن نے انسانی قلب میں بیدار کیا تھا۔

ایک دوسرا کلچر

اس کے برعکس ایک دوسرا کلچر وہ ہے جو زندگی کے تقاضوں سے فرار اختیار کرتا ہے۔ یہ انقلاب چین سے قبل وہاں کے ان افیونیوں کا کلچر تھا جنہیں دریائے زرد کی طغیانیاں اپنی تند موجوں میں بہائے جاتی تھیں۔ اس کلچر کے نزدیک یہ دنیا ایک متعفن لاش کی حیثیت رکھتی ہے جس سے کتوں اور کرگسوں ہی کو کوئی دلچسپی ہو سکتی ہے۔ جن لوگوں کے اعصاب پر مذہبی پیشوائیت

سوار ہوتی ہے وہ اس دنیا کی زندگی سے منہ موڑ کر دوسری دنیا سے لو لگائے ہوتے ہیں۔ بجائے اس کے کہ یہ حرماں نصیب اپنے موجودہ معاشرے میں جنت ارضی کی خوشگواریاں پیدا کریں، یہ موت کے بعد کی جنت کے لئے وقف انتظار رہتے ہیں۔ ان کے نزدیک اس ارضی زندگی کو کوئی اہمیت حاصل نہیں بلکہ ان کی نگاہوں میں اگر کسی زندگی کو قابل ذکر مقام حاصل ہے تو وہ دوسری زندگی ہے۔ وہ غربت و افلاس، بیماریوں اور آفاتِ سماوی کو قضا و قدر سمجھ کر برداشت کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی تخلیقی قوتیں دم توڑ دیتی ہیں اور فکری صلاحیتیں گھٹ گھٹ رہ جاتی ہیں اور بالآخر وہ ان سے یکسر محروم ہو جاتے ہیں۔ نمائشی اور بے معنی رسومات شعارِ زندگی بن جاتی ہیں۔ اور ان کا منتہائے مقصود انسانی نجات قرار پاتا ہے۔ مختصر یہ کہ ایسی قوم جو ہر زندگی سے بے نصیب واقع ہوتی ہے بظاہر اگر وہ زندہ نظر آتی ہیں تو ان کا وجود طاقت ور قوموں کے رحم و کرم کا مرہون ہوتا ہے اور وہ روٹی کے ٹکڑوں تک کی محتاج ہو کر رہ جاتی ہیں۔

کلچر کا حقیقی سرچشمہ اصولاً دنیا میں دو ہی قسم کے کلچر پائے جاتے ہیں۔ ایک وہ جو تقاضائے حیات کو مردانہ وار لبیک کہتا ہے اور دوسرا وہ جو اس سے راہِ فرار اختیار کر لیتا ہے۔ ان میں سے اول الذکر کو بجا طور پر اسلامی کہا جائے گا اور دوسرے کو غیر اسلامی۔ ایک قوم، خواہ وہ کسی دور اور کسی خطہ میں زندگی بسر کر رہی ہو، جب زندگی کے حقائق کو لبیک کہتی ہے تو یقین کر لیجئے کہ وہ اسلامی کلچر کے ایک اہم عنصر کی حامل ہے۔ سکندر اعظم، چنگیز خاں، تیمور لنگ اور ہٹلر تک (جنہیں اسلام سے کوئی تعلق نہیں) ہمارے خراجِ تحسین کے مستحق قرار پاتے ہیں کیونکہ انہوں نے نہ صرف دوسروں کے چیلنج کو قبول کیا بلکہ خود آگے بڑھ کر دوسروں کو دعوتِ مبارزت دی۔ لیکن یہ باہمی مماثلت یہیں تک محدود ہے۔ کیونکہ کلچر کے نشوونما کا انحصار دراصل اس حقیقت پر ہے کہ زندگی کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کی بناء پر جو سیاسی، معاشی اور سائنسی قوتیں حاصل ہوتی ہیں انہیں کن مقاصد اور اقدار کے تحت بروئے کار لایا جائے۔ دیکھنا ہوگا کہ آیا وہ قوم دولت و رزق کے سرچشموں پر اجارہ دار بن کر مسلط ہو جاتی ہے یا نوعِ انسان کی نشوونما کی خاطر انہیں عام کر دیتی ہے؟ آیا وہ کمزور قوموں میں لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم کرتی ہے یا نوعِ انسانی کی ربوبیت کی علمبردار بن جاتی ہے۔ آیا وہ اپنے لئے خالص مادی اقدار کو سرچشمۂ ہدایت قرار دیتی ہے یا مستقل اقدارِ حیات کو۔ قرآن کریم کا دعویٰ یہ ہے کہ صرف اسی کلچر کو نشوونما اور ارتقاء کے امکانات حاصل ہیں جو نوعِ انسانی کی ربوبیت اور بقاء و استحکام اپنا نصب العین قرار دیتا ہے اور مستقل اقدار کی روشنی میں سرگرم سفر ہوتا ہے۔

ایک کلچر کا استحکام ان نفع بخشیوں پر منحصر ہے جو اس کی بدولت نوعِ انسانی کو نصیب ہوتی ہیں۔ یہی وہ

کلچر ہے جس کا زندہ اور درخشندہ نتیجہ اس دنیا میں بھی جنت کی زندگی اور اس کے بعد کی زندگی میں بھی جنت۔

ڈاکٹر سید عبداللطیف نے اسی حقیقت کی نشاندہی کرتے ہوئے کہا ہے کہ "کوئی قوم یا معاشرہ مادی ترقی کے میدان میں ممتاز مقام حاصل کر سکتا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کی نفع بخشیوں کی تقسیم ایک مخصوص دائرے میں عادلانہ تقسیم بھی ہو۔ اس کے باوجود وہ نوعِ انسانی کے عالم آراء مفاد کے لئے ایک خطرہ بن سکتا ہے" اس سلسلے میں یہ مزید کہوں گی کہ بعض اوقات ایک دولت مند قوم اپنے بقاء و تحفظ کے لئے دیگر اقوام کو امداد مہیا کرتی ہے لیکن انجام کار اس کا کوئی ٹھوس اور مثبت نتیجہ مرتب نہیں ہوتا۔ مطمع نظر پوری نوعِ انسانی کا مفاد ہونا چاہیئے۔ نہ کہ کسی مخصوص گروہ بندی کا۔

کلچر کا عروج و زوال

بنابریں نشوونما و ارتقاء کا معیار مستقل اقدار قرار پائیں گی۔ کلچر کا عروج و زوال نہ تو جدلی مادیت (DIALECTIC MATERIALISM) اور تاریخی وجوب (HISTORICAL NECE""ITY) کے ان نظریات کے مطابق بروئے کار آتا ہے جو ہیگل اور کارل مارکس نے پیش کئے ہیں۔ اور نہ ہی سپینگلر کے پیش کردہ تصور کے مطابق کہ "تہذیب، کلچر کے تخلیقی عمل کی پیداوار ہے" اور نہ یہ کہ غنچہ و شاخ غنچہ میں ہے رازِ آفرینشِ گل۔ کلچر اور تہذیب کا باہمی تعلق اس نوعیت کا نہیں جیسے زندگی کے بعد موت یا فراخی کے بعد تنگی کو لابدی قرار دیا جاتا ہے۔ ایک کلچر اگر انسانی ذہن کے خود ساختہ قوانین پر متفرع ہو تو اس کا زوال لازمی ہے لیکن اگر اس کی اساس وحی پر مبنی مستقل اقدار پر قائم ہے تو اس کا تخلیقی عمل ایک صراطِ مستقیم کی وسعتوں اور رفعتوں کی سمت بڑھا چلا جاتا ہے۔

اسلامی کلچر کی کارفرمائیاں

اس نقطۂ نظر سے اسلامی کلچر اپنی مثال آپ ہے۔ یہ اس "گردشِ دولابی" کے جمود آفریں چکر کو ختم کر دیتا ہے جس میں نوعِ انسانی پہلے دن سے الجھی چلی آ رہی ہے۔ اسلام نے انسانوں کو "آواگون" کے توہماتی تصورات سے، جن کے چکر میں وہ گرفتار تھے، نجات دلائی اور امیدوں کے وہ چراغ روشن کئے جن کی روشنی میں انسانی صلاحیتوں کی مسلسل، مکمل، آزادانہ اور مطلوبہ نشوونما کے سامان پیدا ہوئے۔ یہ "انسانی نجات" اور "نفیٔ ذات" کے فلسفوں کی بیخ کنی کرتا ہے اور ذاتِ انسانی کی نشوونما کی اہمیت واضح کرتا ہے۔ ہر وہ قوم، جو اپنے معاشرے میں اس کلچر کو سموتی ہے، صحیح معنوں میں ایک مہذب قوم کی حیثیت رکھتی ہے۔ فرانس جیسا ملک جسے نمائشی تہذیب و شائستگی میں امامت کا درجہ حاصل ہے انسانیت کی عدالت میں وحشی اور غیر مہذب کے سوا اور کسی لقب سے نہیں پکارا جا سکتا۔ الجزائر کی شہرۂ آفاق بیٹی، جمیلہ کی یہ دردبھری پکار یاد کیجئے کہ "الجزائر کو ملیامیٹ کرنے کے سلسلے میں

فسادات کی منصوبہ بندیاں یقیناً فرانس کی اپنی ہلاکت کا سامان بن جائیں گی۔" زندگی کی نمائشی سطح پر ایران کے ساسانیوں سے بڑھ کر تہذیب و شائستگی میں کون ممتاز تھا؟ لیکن غور کیجئے کہ کس طرح عرب کے بظاہر اکھڑ اور اجڈ مسلمانوں نے ان کی عظیم سلطنت کو زیر و زبر کر کے رکھ دیا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ ان عربوں کے قلوب داذہان، پاکیزگی کی جلوہ گاہ بن گئے تھے۔

یہی کلچر تھا جس نے زندگی کے تقاضوں کو لبیک کہا۔ زندگی کی مستقل اقدار سے رہنمائی اور روشنی حاصل کی اور پھر ایک دن آیا جب اس نے تحریک پاکستان میں اساسی حیثیت حاصل کر لی۔ ہو سکتا ہے کہ ہم نے اس تحریک سے غداری کی ہو۔ لیکن ہے کوئی جو اس تحریک کی وجہ جواز کے متعلق لب کشائی کی جرأت کرے اور ہم سے یہ سوال کر سکے کہ ہمارا مقصودِ حیات کیا ہے؟ یاد رکھئے اسلام نے ہمیں کوئی مخصوص تہذیب عطا نہیں کی بلکہ وہ بے مثال کلچر بخشا ہے جس کا تحفظ اور بقاء و استحکام ہماری زندگی کا مشن ہے ہم جیتے ہی اس کے لئے ہیں اور اسی کی خاطر مریں گے۔ اگر کسی شخص کو اس کلچر کے آثار کی نشاندہی مطلوب ہے تو ان نقوش تابندہ کا سراغ موہنجو دارو اور ہڑپہ کے کھنڈرات سے نہیں ملے گا اس کے تابندہ نقوش بدر و حنین کے میدانوں میں درخشندہ ستاروں کی طرح جگمگاتے نظر آئیں گے۔ (شمیم انور)

خریدارانِ طلوعِ اسلام کیلئے

جن خریداروں کا چندہ ختم ہو رہا ہے انہیں اُن کے پرچہ میں، پہلا ورق الٹتے ہی ایک مطبوعہ کارڈ منسلک نظر آئے گا۔ براہ نوازش، حسب منشاء اس کارڈ کی خانہ پُری کر کے، بلا ٹکٹ لگائے، اولین فرصت میں ڈاک کے سپرد کر دیجئے۔ اس معاملہ میں تاخیر اور خاموشی بڑی پریشانی کا باعث ہوگی۔

(ناظم ادارہ)

سالارِ انسانیت

گردِ او گردد حریمِ کائنات

(صفدر سہیلی)

شاید ہی کوئی دن ایسا گذرتا ہو جب دنیا کے کسی نہ کسی حصے میں کسی قومی زعیم کی یاد نہ منائی جاتی ہو۔ بڑے بڑے سیاسی لیڈروں کی یاد، مذہبی رہنماؤں اور روحانی پیشواؤں کی یاد۔ آزادی و استقلال کے قائدین اور مملکتوں کے بانیوں کی یاد، فوجی سپہ سالاروں اور شمع آزادی کے پروانوں کی یاد، فلسفہ و حکمت کے مفکرین اور داعیانِ انقلاب کی یاد۔ یہ تقریبات قوموں کی عظمت کے نشان اور ان کی تاریخ کا سرمایۂ تازش و افتخار قرار پا گئی ہیں۔ ان یادگار قومی مواقع پر اپنے اپنے زعمائے قوم کے کارناموں کو خراجِ تحسین پیش کیا جاتا ہے۔ ان کے آستانۂ عظمت پر شردھا کے پھول چڑھائے جاتے ہیں۔ ان کے مجسموں کی آرائش و تزئین کی جاتی ہے۔ ان کی یاد میں شاعروں کے شاہنامے مرتب ہوتے ہیں۔ ان کی فتحمندیوں اور کامرانیوں کے گیت گائے جاتے ہیں۔

عالمگیر قیادت کا مدعی کوئی بھی نہیں

یہ سب کچھ ہوتا ہے اور انتہائی فخر و مباہات کے گرما گرم جذبات و احساسات سے سرانجام پاتا ہے۔ لیکن یہ سب کچھ ہوتے ہوئے، ان میں سے کسی ایک رہنما اور زعیم کے متعلق یہ دعویٰ نہیں کیا جاتا ــــ اور نہ کیا جا سکے گا ــــ کہ اس نے پوری نوعِ انسان کی نفع مندی اور سربلندی کے لئے کوئی قابلِ ذکر کارنامہ سرانجام دیا ہو۔ عالمِ انسانیت کی فلاح و کشاد کا کوئی اجتماعی ضابطہ اور پروگرام تجویز کیا ہو۔ کوئی ایسا معرکہ بروئے کار لایا ہو جس کی بدولت اس کا اپنا ملک یا قوم نہیں، بلکہ اولادِ آدم کے عالمگیر نشوونما کا سامان پیدا ... ہوا ہو۔

یقیناً سب کو، بہرحال اور بجا طور پر اعتراف کرنا پڑے گا کہ یہ سب مشاہیر کسی ایک ملک یا قوم کے زعیم تھے۔ ان کی عظمت کے شہکار کسی مخصوص خطۂ زمین، نسل اور قوم سے وابستہ تھے۔ ان کی خدماتِ جلیلہ کا دائرہ جغرافیائی حد بندیوں میں محدود رہا۔ انھوں نے عالمگیر انسانیت کے لئے نہ کوئی دعوتِ فکر و نظر پیش کی۔ نہ عالم آرا نصب العین کے لئے کوئی کارنامہ سرانجام دیا اور نہ کوئی ایسی یادگار چھوڑی جسے عالم انسانیت کا حقیقی سرمایہ قرار دیا جا سکے۔ جہاں تک تاریخ کی شہادت کا تعلق ہے اس قسم کا کوئی دعویٰ آجتک نوعِ انسانی کے سامنے نہیں آیا۔

عالمگیر انسانیت کی قیادتِ عظمیٰ

لیکن ریگ زارِ عرب کے جس دُرِ یتیم کا جشن میلاد آج دنیا میں منایا جا رہا ہے جس داعیٔ انقلاب کی بارگاہِ عظمت میں ہم آج خلوصِ دنیاز کی نذر پیش کر رہے ہیں اس کی داستانِ حیات اور کارفرمائیاں کسی خاص خطۂ زمین اور نسل سے وابستہ نہیں بلکہ اس کی دعوتِ انقلاب میں پوری نوعِ انسانی کی سربلندیوں اور رفعتوں کا سامان موجود تھا۔ اس کے نغمۂ حیات نے فاران کی چوٹیوں سے بلند ہو کر فضاؤں میں جو ارتعاش پیدا کیا وہ پورے کاروانِ انسانیت کے لئے بانگِ رحیل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی دعوتِ جہاد کو لبیک کہنے والے عرب کے حدی خوان ہی نہیں تھے بلکہ ان قطاروں میں حبش کے بلالؓ۔ روم کے صہیبؓ اور فارس کے سلمانؓ بھی صف آرا نظر آتے تھے۔ اس نے اولادِ آدم کو جس مقصدِ حیات کی طرف بلایا وہ عربوں کے لئے ہی ابدی خوشگواریوں کی نوید جانفزا ثابت نہیں ہوا بلکہ عجم کے شبستان بھی اس کی جلوہ بالیوں سے برابر جگمگا اٹھے۔ اس کے مقدس ہاتھوں نے عربوں ہی کی زنجیریں نہیں توڑیں بلکہ ایران و عراق اور روم و شام کی ملوکیت کے بندھنوں کو بھی ریزہ ریزہ کر دیا۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کے عطا فرمودہ تصورِ زندگی نے نوعِ انسانی کی طبیعی زندگی کو ہی حسن و جمال کے آراستہ نہیں کیا بلکہ طبیعی زندگی کی گہرائیوں میں محوِ خواب لازوال صلاحیتوں کو بھی وہ اطمینان عطا کی کہ آدم اپنی فردوسِ گم گشتہ کو پانے اور اس زندگی کے بعد ابدی خوشحالیوں سے مالا مال ہونے کے قابل ہو گیا۔

بے مثال مقام و منصب

ساڑھے تیرہ سو برس گذر گئے۔ اس عرصۂ دراز میں کاروانِ انسانیت نت نئے انقلابات کی کن کن کٹھن راہوں سے گذرا۔ دنیا کے نقشے کس طرح بار بار زیر و زبر ہوئے لیکن تاریخ کی پیشانی آجتک برابر انسانیت کے اس قافلہ سالار کی عظمت کردار کے حضور میں جھکی ہوئی ہے۔ عرب و عجم کی مائیں ہزاروں برس میں اس فقید المثال اور نادر الوجود شخصیت کا

نقشِ ثانی پیدا نہ کر سکیں جو حلیمہ سعدیہ کی آغوش میں پروان چڑھا یتیمی اور بے کسی کے یاس انگیز اور لرزہ فگن مراحل سے گذرا۔ قدم قدم پر آگ اور خون کے ہولناک محاربوں اور مقاتلوں سے دوچار ہوا لیکن اس کے بڑھتے ہوئے قدم ایک لمحہ کے لئے بھی رک نہ سکے۔ اس کے قدموں کی ایک ایک جنبش سے، حرکت اور عمل کے حیات آفریں چشمے پھوٹ نکلے۔ وہ انسانیت کے آسمان پر آفتاب عالمتاب بن کر چمکا اور اس کی روشنی میں قوموں اور امتوں کے بھٹکے ہوئے قافلے اپنی گم گشتہ منزلیں پانے کے قابل ہو گئے۔ تاریخ انسانی کے ایک انتہائی نازک مرحلہ پر وہ ابرِ بہار بن کر نمودار ہوا۔ بلندیوں اور پستیوں پر جھوم جھوم کر برسا اور انسانیت کے خزاں رسیدہ گلشنوں میں رنگ بہار پیدا کر گیا۔

اس جہان کون و فساد میں جب اس نے آنکھ کھولی تو چاروں طرف ظہر الفساد فی البر والبحر کا منظر بپا تھا۔ ہر شے اپنے مقام سے ہٹ چکی تھی۔ زندگی اصولِ اقدار سے بیگانہ ہو چکی تھی اور انسان ہر ضابطۂ اخلاق سے باغی تقاضوں کا نام تھا قوت اور استبداد کے تقاضوں کا اور ہر حکومت آئینہ دار تھی ظلم و جور اور بربریت کی۔ یہ تھا نقشہ عالمِ انسانیت کا جس میں انقلاب بپا کرنے کیلئے عرب کا یہ ظاہراً ایک یتیم اور بے بس نوجوان خدا کے پیام آخرین کا داعی اول علمبردار بن کر میدان میں نمودار ہوا۔ جب وہ غارِ حرا کے کنج تنہائی سے باہر نکلا تو ایک اکمل ترین ضابطۂ حیات لے کر سامنے آیا جس کی مثال اس سے قبل کی انسانی تاریخ میں موجود نہ تھی اور بعد کی نسلوں کے لئے تو وہ قیامت تک حرفِ آخر قرار پا گیا۔

اس ضابطۂ حیات کا ایک ایک گوشہ ہر دور اور پورے عالمِ انسانیت کے مستقبل کے لئے ابدی سربلندیوں کا امین تھا۔ یہ زندگی کی وہ مستقل اقدار تھیں جن کے سہارے تند و تیز طوفانوں میں زندگی کے سفینے ساحلِ مراد تک پہنچ سکتے تھے۔ یہ دوسرے چشمۂ تصورِ حیات تھا جس کی بدولت تہذیب و تمدن اور اخلاقیات کی وہ کشتِ نو بہار فضائے عالم میں لہلہائی جس کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے نوعِ انسانی کی آنکھیں ترس گئی تھیں۔ ہاں، یہ ضابطۂ حیات اور یہ مستقل اقدار کسی ایک ملک، قوم یا دور کے لئے مخصوص نہیں تھیں۔ اس شجرِ طیب کی شاخیں حدود فراموش اور اس کے برگ و بار تاریخ کے ہر دور میں جنت در آغوش بننے کا سامان رکھتے تھے۔ مزید براں یہ دستورِ حیات کسی انسانی فکر و نظر کا شاہکار نہیں تھا بلکہ اس کا سرچشمہ وہ حقیقتِ کل تھی جہاں سے آفتاب و ماہتاب اور ستاروں کو ضوفشانیاں نصیب ہوئیں۔

عظمتِ کردار کی جھلکیاں

اس لازوال بے مثال جہانگیر اور عالم آرا دستورِ حیات کی تفہیم بخشیوں سے ذرا ہٹ کر اس ذاتِ رسالتمآبؐ کی عظمتِ کردار کی طرف آیئے جسے وحی کی ان

جلوہ سامانیوں سے سرفراز کر کے نوعِ انسانی کی قیادتِ عظمیٰ کے لئے منتخب کیا گیا، تو ہر چشمِ بصیرت اس حسنِ انتخاب پر بے تابانہ جھوم اُٹھے گی۔ سرزمینِ عرب کے آتش فشاں ریگ زاروں سے ایک بے یار و مددگار یتیمی اور بے بسی کے عالم میں تاریخ کے عظیم ترین فریضۂ حیات کی بجا آوری کے لئے اٹھتا ہے۔ اس کی راہ کانٹوں سے بھرپور تھی۔ مشکلات و موانعات کے صبر آزما پہاڑ سامنے تھے۔ قدم قدم پر منافرت کے شعلے بھڑک رہے تھے بغض و عناد کے زہریلے تیروں کی بارش ہو رہی تھی۔ غیظ و غضب کے طوفان اُمڈ رہے تھے۔ کفر و طغیان کے خوفناک لشکروں سے مقابلہ تھا۔ اپنوں اور بیگانوں کا جوشِ انتقام بجلیاں گرا رہا تھا۔

لیکن ہوا کیا؟

صلوٰۃ و سلام کے کروڑ در کروڑ پھول نچھاور ہوں آمنہ کے اس یتیم لال پر! زندگی کی ان کٹھن اور ہولناک راہوں پر وہ بے مثال عزم کے ساتھ مردانہ وار آگے بڑھا۔ کفارِ مکہ کے ترکشوں کے سارے تیر اس کے عالم آرا عزائم اور ولولوں کو چھلنی کرنے کی حسرت میں ختم ہو گئے۔ خداوندانِ طائف نے اسے لہولہان کرنے کے لئے سرزمینِ طائف کا آخری پتھر تک آزما ڈالا۔ اُسے قدم قدم پر بدر و حنین کے خوفناک معرکوں اور معاندوں سے نبرد آزما ہونا پڑا۔ ابتلاء و آزمائش کی تند و تیز آندھیاں اٹھیں۔ حوادث کے پے بہ پے اور غضب آلود طوفان حرکت میں آئے مصائب و آلام کی تیرہ و تار گھٹائیں چھا گئیں لیکن عرب کا یہ مہر عالمتاب ہر گوشے میں اپنی رحمت بھری مسکراہٹیں پھیلاتا رہا۔ شمعِ رسالت کی ضوفشانیاں بلندیوں اور پستیوں کو برابر اپنی آغوشِ لطف و مرحمت میں لیتی چلی گئیں۔ نبوت کا چراغ نور افشاں رہا۔ پروانے جلتے رہے۔ جل جل کر اس کی جلوہ باریوں کی صداقت کی شہادت اور عطا فرمودہ منزل کا سراغ دیتے چلے گئے۔ کفارِ مکہ کی پھونکیں اس چراغ کو بجھا نہ سکیں اور نورِ خدا غیظ و غضب کی ان ناعاقبت اندیشیوں اور ناحقیقت شناسیوں پر برابر خندہ زن رہا۔ سرزمینِ عرب کا ذرہ ذرہ اس کی جلوہ آرائیوں سے جگمگا اٹھا۔ مدائن کے قصرِ ابیض میں، انطاکیہ کے ایوانِ قیصری میں، مصر کے شاہی ایوانوں میں، قادسیہ اور یرموک کے میدانوں میں، بحرِ ظلمات کی طوفانی لہروں، اور دجلہ و فرات کے کناروں پر ہر جگہ کروڑوں انسانوں نے اس چراغ کی روشنی میں اپنی منزلِ مقصود تلاش کی۔ اور رشد و ہدایت کی ان نور ریزیوں کا سلسلہ دراز بڑھتے بڑھتے گنگ و جمن کے ساحلوں اور اندلس کے مرغزاروں تک پہنچ گیا۔

عرب کے اس چاند پر ہزاروں سلام جو ان طوفانوں میں، اپنوں اور بیگانوں، دوستوں اور دشمنوں سب کے لئے ابرِ رحمت اور صبحِ بہار کی ہزاروں بشارتیں لئے سوئے منزل جادہ پیمارہا۔ فتحِ مکہ کی نورانی صبح کو جب وہ فتح و نصرت کے پرچم اڑاتے مکہ میں داخل ہوا تو نعرۂ انتقام بلند کرنے کے بجائے اس پرچم کی اڑانیں لاتثریب

علیکم الیوم کا رحمت بھرا اعلان بن گئیں۔ اس کے لطف و کرم کی بارشوں سے ہر تشنہ لب سیراب ہوا ——— ہاں اس نے ابوسفیان جیسے دشمنوں تک کو معاف کر دیا۔

تاریخ کی میزان پر ایک قدم اور آگے بڑھئے اور تاریخ کی میزان میں اس کے مقاصد عالیہ کی رفعت اس کی سیرت طیبہ کی عظمت اور اس کے درخشندہ کارناموں کی عالم آرائی کو نگاہوں کے سامنے لایئے اس کی کامرانیاں اور فتحمندیاں تاریخ انسانی کا بے مثال باب ہیں۔ سکندر اعظم اور جولیس سیزر جیسے فاتحین عالم اور کشور کشا اس کے شاہکاروں کی گرد تک نہیں پہنچ سکتے۔ ان سپہ سالاروں کی کشور کشائیاں ان کی اپنی موت کے ساتھ ہی عظمت رفتہ کے کھنڈرات میں بدل گئیں لیکن عرب و عجم کا یہ سالار اعظم چودہ صدیاں گذر جانے کے باوجود آج بھی اطراف واکناف عالم کے کروڑوں انسانوں کے دلوں پر حکومت کر رہا ہے۔ اس کے حلقہ بگوشان عقیدت میں ایسے ایسے باجبروت شہنشاہ نظر آئیں گے جن کی جہانبانی کا سلسلہ سکندر اعظم سے کہیں بڑھ کر وسیع تھا۔ ایسے ایسے اولوالعزم کمانڈر نظر آئیں گے جن کی شمشیر خارا شگاف جولیس سیزر سے کہیں بڑھ چڑھ کر شہنشاہان عالم کے درباروں میں زلزلے برپا کر دیتی تھی۔

یہ اس کی عظمت کا ایک معمولی سا نقش تھا کہ نجاشی والیٔ حبش، جیفر ملک عمان، اکیدر شاہ دومۃ الجندل نجد کے وحشیوں، تہامہ کے بدوؤں اور یمن کے مسکینوں کے شانہ بشانہ اس کی فرماں روائی کا اعتراف کر رہے تھے۔ عثمانؓ بن طلحہ، اور عبداللہؓ بن سلام بتدریج ابراہیمیت اور یہودیت کی مسند ہائے امامت و پیشوائیت کو چھوڑ کر اس سالار انقلاب کی قیادت پر ناز کر رہے تھے۔ عمروؓ بن عاص جو شاہ حبش کے دربار میں کفار مکہ کا نمائندہ بن کر گیا تھا شاہ عمان کے دربار میں داعیٔ اسلام بن کر داخل ہوا۔ جنگ احد میں کفار مکہ کا کمانڈر خالد بن ولیدؓ آخر ایک دن لات و عزیٰ کے بتوں کو توڑتا اور شام و عراق اور روم میں اسلام کی عظمت کے جھنڈے گاڑتا دیکھا گیا۔ طائف کا سردار عبد یالیل جس کے اشارے پر حضور رسالتمآبؐ پتھروں سے لہولہان کیے گئے تھے آخر ایک دن اپنی پوری قوم کے ساتھ اسلام کے آستانۂ عظمت پر سر تسلیم خم کر رہا تھا۔ امیر حمزہؓ کا قاتل، وحشی، رسول خدا کے عفو عام سے فیضیاب ہو کر اسلام کی جنگیں لڑتا رہا اور آخر اس کا حربہ مسیلمہ کذاب کے جسم سے پار ہوا۔ کفار مکہ کا سردار جو احد کے میدان میں ان کی فوج کا سپہ سالار تھا۔ فتح مکہ کی انوکھی صبح کو اسلام کی بارگاہ عظیم میں سر تسلیم خم کر رہا تھا اور نجران کی حکومت اس کے سپرد کی جا رہی تھی۔

عالمگیر تصور قومیت کا داعی اس کی فتحمندیوں اور فیض بخشیوں کا عظیم ترین شاہکار یہ تھا کہ اس نے خون، رنگ، نسل اور وطن کے تمام امتیازات ختم کر کے آئیڈیالوجی کے اشتراک

پر ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ کا ایک نیا نقشہ قائم کیا۔ انسانی قومیت کی اس عالم آرا اور انوکھی تشکیل میں حبش کے بلالؓ اور روم کے صہیبؓ، اس قائدِ انسانیت کی اپنی ملت کے افراد قرار پا گئے اور گھر کے ابولہب اور ابوجہل (حقیقی چچا ہونے کے باوجود) غیر قوم کے افراد بن گئے۔ قومیت کی اس تشکیلِ نو کا نقشہ اس وقت پوری طرح نکھر کر دنیا کے سامنے آ گیا جب بدر کے میدان میں ابوبکرؓ ایک طرف شمشیر بکف کھڑے تھے اور ان کا بیٹا دوسری طرف۔ حضرت عمرؓ اس طرف تھے تو ان کے ماموں دوسری طرف۔ حضرت علیؓ ادھر تھے اور ان کے بھائی عقیل ادھر۔ حضرت حذیفہؓ ادھر تھے اور ان کے باپ عتبہ ادھر۔ خود کاروانِ انسانیت کا سالارِ اعظم ایک طرف تھا اور اس کا حقیقی چچا عباس اور داماد ابوالعاص دوسری طرف۔ آسمان کی نگاہیں پہلی بار عصبیت جاہلہ کے رشتوں کو تلوار کی دھار سے کٹتے دیکھ رہی تھیں اور آئیڈیالوجی کے اشتراک پر ایک ایسی ملت ظہور میں آ رہی تھی جس کا سرنامان گرد وطن سے پاک تھا۔ قبیلوں، ذاتوں اور نسلوں کے تعصبات سے پاک تھا جس میں محمود و ایاز شانہ بشانہ حقیقی بھائیوں کی طرح ایک صف میں کھڑے تھے جس میں نہ عربی کو عجمی پر کوئی فخر تھا، نہ عجمی کو عربی پر کوئی امتیاز۔ جمعیتِ آدم کا یہ انوکھا اور آسمانی تصور، نوعِ انسانی کے بھٹکے ہوئے قافلوں کو ببانگِ دہل بتا رہا تھا کہ انسانیت ایک مستقل اور ناقابلِ تقسیم وحدت ہے اور قبیلوں، ملکوں، خاندانوں، نسلوں کی بنا پر اس کے حصے بخرے نہیں کئے جا سکتے۔ اس عالمگیر انسانی نظام کو رنگ و خون کے امتیازات میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ اس میں نہ جغرافیائی تقسیم کی لکیریں کھینچی جا سکتی ہیں اور نہ مختلف وطنوں کے نام پر کوئی دیواریں کھڑی کی جا سکتی ہیں۔ تاریخِ انسانی کا وہ کس قدر وجد آفریں منظر تھا جب حجۃ الوداع کی تقریب پر عرفات کے میدان میں قائدِ انسانیت کی زبان سے وحدتِ انسانیہ کے آخری منشور کا اعلان کیا جا رہا تھا اور دوسری طرف خالقِ کائنات کی بارگاہ سے وحیِ خداوندی کا آخری پیغام نازل ہو رہا تھا کہ

الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا

نوعِ انسانی کے نام وحی کی یہ آخری آواز بتا رہی تھی کہ وحدتِ انسانیہ کا قیام منشائے دین کا اتمام ہے۔ یہ ہو گیا تو تکمیلِ دین کے مقصدِ عظیم کی بجا آوری بھی ہو گئی۔ نبوت کا یہی وہ شاہکارِ عظیم تھا جس کی تکمیل حضور رسالتمآبؐ کے مقدس ہاتھوں اپنے حاصلِ کمال کو پہنچی اور تشکیلِ قومیت کے سلسلے میں فکرِ انسانی کے صدیوں کے ناکام تجربوں کے بعد علم و بصیرت کی بارگاہیں آج بجا طور پر اس حقیقت کا اعتراف کر رہی ہیں کہ قومیت کی حقیقی تشکیل آئیڈیالوجی اور صرف آئیڈیالوجی کے اشتراک پر ہونی چاہیئے۔ رنگ، نسل اور وطن کی اساس پر اس کی تشکیل کے تمام تجربے ناکام بلکہ ہلاکت آفریں ثابت ہو چکے ہیں۔ ———

گذشتہ ہر دو عالمگیر جنگیں انہیں تجربات کے وحشت انگیز ثمرات تھے۔

ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ کا یہی وہ نقشہ تھا جو اس ذاتِ اقدس و عظیم کا بے مثال شاہکار قرار پاتا ہے۔ اسی اساس پر اوّلین اسلامی مملکت متشکل ہوئی اور اس مملکت کا مقدس بانی جب اس جہان رنگ و بو سے رخصت ہو رہا تھا تو اس مملکت کا پرچم پورے عرب پر لہرا رہا تھا۔ اس کی کشور کشائیاں ایران و روما کی دیواروں سے ٹکرا رہی تھیں۔ اس عالم آرا مشن کی تکمیل کے لئے وہ اپنے جانشینوں پر تسخیرِ عالم کے دروازے کھول گیا اور ایک دن آیا جب اس مملکت کے پرچم دیوارِ چین سے اندلس کے ساحلوں تک لہرا رہے تھے۔

ہر شعبۂ زندگی میں

زندگی کی شاہراہِ عظیم پر اس انسانِ کامل کے جگمگاتے نقوشِ قدم آج بھی پوری آب و تاب سے یہ شہادت دے رہے ہیں کہ دنیا کے آخری نبیؐ اور کاروانِ انسانیت کے آخری قائد کو ہر شعبۂ حیات میں اس قدر فقید المثال و عظمت آفریں ہونا چاہیئے تھا۔ اس سیرتِ طیبہ کا ایک ایک نقش بتاتا ہے کہ مقصدِ حیات کی شایانِ شان بجا آوری کے لئے نوعِ انسانی کو کس اسوۂ حسنہ کی ضرورت تھی اور حضورؐ نے اس ضرورت کو کس حسن انداز سے پورا کیا۔ دینِ خداوندی کی اشاعت و تبلیغ میں، ازواجِ مطہرؓ کے درمیان عائلی زندگی میں، جنگ کے بھڑکتے ہوئے شعلوں میں، منصبِ عدالت اور مقامِ نبوت کی ذمہ داریوں میں وہ نوعِ انسانی کی قیادت کا بے مثال نمونہ تھا۔ زندگی کے ہر میدان میں اس کی قیادت بہترین نتائج اور ثمرات کی ضامن تھی وہ ایک بہترین شوہر، بہترین باپ، بہترین دوست، بہترین سرپرست، بہترین قائد، بہترین سپہ سالار، بہترین مدبر، سیاستِ مدن کا بہترین ماہر، اقتصادیات کا بہترین استاد، علم و حکمت کے اسرار و غوامض کا بہترین رازدان اور بالآخر خدا اور اس کے بندوں کے درمیان معرفتِ دین کا بہترین رشتہ ثابت ہوا اور تاریخ کے صفحات پر ایسے لازوال اور زندہ جاوید نقوش چھوڑ گیا جو انسانیت کے گم کردہ راہ قافلوں کے لئے رشد و ہدایت کے ضوفشاں مینار ہیں۔

اغیار کا خراجِ تحسین

ایک قائدِ انسانیت کی عالم آرا عظمت کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکے گا کہ اغیار کی بارگاہ سے چوٹی کے مشاہیرِ عالم اس کے حضور خراجِ تحسین پیش کر رہے ہیں۔

خوشتر آں باشد کہ سرِّ دلبراں
گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

یورپ کا عظیم صاحبِ قلم کارلائل جس کے زورِ قلم کے سامنے مغرب کے قلمکاروں کی گردنیں خم ہیں، حضورِ رسالتمآبؐ میں خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

عربوں کے لئے یہ انقلاب ایک نئی زندگی تھی جو انہیں تاریکی سے نور کی طرف لے آئی۔ عرب اس کے ذریعے پہلی بار زندہ ہوا۔ ایک ایسی قوم جو ابتدائے آفرینش سے گمنامی کے عالم میں ریوڑ چراتی پھرتی تھی، کی طرف ایک رسول آیا اور اپنے ساتھ وہ پیغام لایا جس پر وہ قوم ایمان لے آئی۔ وہ دیکھو! وہی گمنام چرواہے دنیا کی ممتاز ترین قوم بن گئے۔ وہ حقیر قوم ایک عظیم الشان ملت میں تبدیل ہو گئی۔ ایک صدی کے اندر اندر عرب ایک طرف غرناطہ اور دوسری طرف دہلی تک چھا گئے۔ اور اس کے بعد سینکڑوں برس سے وہ اسی شان و شوکت اور درخشندگی و تابندگی سے کرۂ ارض کے ایک عظیم حصہ پر مسلط ہیں۔ (یہ سب ایمان کی حرارت سے ہوا)۔ ایمان بہت بڑی چیز ہے۔ ایمان ہی سے زندگی ملتی ہے۔ جونہی کسی قوم میں ایمان پیدا ہوا اس قوم کی تاریخ، اعمال میں نتائج اور روح میں بالیدگی پیدا کرنے والی بن گئی۔

وہ عرب ——— یہ محمدؐ ——— اور ایک سو سال کا عرصہ!

کیا یہ انقلاب ایسا نہیں جیسے ریت کے ایک گمنام سیاہ ٹیلے پر آسمان سے بجلی کی لہر آگرے اور وہ ریت کا تودہ دیکھتے ہی دیکھتے ایک آتشگیر مادہ میں تبدیل ہو کر اس طرح بھک سے اڑ جائے کہ دہلی سے غرناطہ تک ساری فضا اس کی لپیٹ میں آجائے۔

نوعِ انسانی خشک نیستاں کی طرح ایک شرارہ کے انتظار میں تھی۔ وہ شرارہ اس بطلِ جلیل کی صورت میں آسمان سے آیا اور تمام نوعِ انسانی کو شعلہ صفت بنا گیا۔

ThoMAs carlyle in Heroes and Hero-worship(Page 66

یہ کارلائل کی نذرِ عقیدت تھی۔ اب سر جارج برنارڈ شا سامنے آتے ہیں یورپ کا یہ عظیم شہرہ آفاق اور خود پسند فلسفی، جو اپنے آپ سے بڑھ کر دنیا کے کسی بڑے سے بڑے انسان کو اہمیت نہیں دیتا، جب بارگاہِ رسالت مآبؐ کی عظمت کو نگاہوں کے سامنے لاتا ہے تو بیساختہ پکار اٹھتا ہے کہ

میں نے محمدؐ کے مذہب کو اس کی توانائی کی بنا پر ہمیشہ احترام کی نگاہ سے دیکھا ہے میرے نزدیک دنیا میں تنہا یہی مذہب ہے جس میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ دنیا کے بدلتے ہوئے حالات کا ساتھ دے سکے اور یہی وجہ ہے کہ اس کا پیغام ہر زمانے کے لوگوں کو اپیل کر سکتا ہے۔ میں نے اس حیرت انگیز شخصیت کا مطالعہ کیا ہے اور میرا خیال ہے

کہ وہ مسیح کا نقیض ہونے کی بجائے، بجا طور پر نوعِ انسانی کا نجات دہندہ کہلا سکتا ہے
میرا یقین ہے کہ اگر آج اس جیسا کوئی انسان دنیا کی آمریت سنبھال لے تو وہ اس کے مسائل
کا حل اس خوبی سے کر سکتا ہے کہ یہ دنیا پھر سے اس امن و مسرت کی زندگی کو پا لے جس کی
اسے آج اشد ضرورت ہے۔ میں نے یہ پیش گوئی کی ہے کہ جس طرح آج کا یورپ اس
مذہب کو قبول کرنے پر آمادہ ہو رہا ہے اسی طرح کل کا یورپ اسے قبول بھی کرے گا۔

آگے بڑھئے اور دیکھئے کہ تاریخ مذہبیات کا مشہور عالم لیمرٹین اپنے خراجِ تحسین کا والہانہ اختتام کن الفاظ سے کرتا ہے ——

ان تمام معیاروں اور پیمانوں کو اپنے ساتھ لے آؤ جن سے انسانی عظمت و بلندی
کو ناپا اور پرکھا جا سکتا ہے اور اس کے بعد ہمارے اس سوال کا جواب دو کہ
کیا دنیا میں اس سے بڑا انسان بھی کوئی
پیدا ہوا ہے؟

LAMARTINE-HISTOIRE DE LA TURQUIE VOL.II P.P.276-277

لیمرٹین کے یہ الفاظ ایک چیلنج کا درجہ اختیار کر گئے ہیں اور قیامت تک یہ ممکن نہیں کہ اس چیلنج کا کوئی جواب دے سکے۔

یہ ہیں مشاہیرِ عالم کی وہ تاریخی اور ناقابلِ انکار شہادتیں جو علم و تاریخ کی دنیا میں شہرۂ آفاق حیثیت رکھتی ہیں اور برملا اعلان کر رہی ہیں کہ نوعِ انسانی کی عالمگیر اور عالم آرا قیادت کا جو شرف حضور رسالت مآبؐ کو نصیب ہوا، تاریخ اس کی کوئی دوسری مثال پیش نہیں کر سکتی۔ حقیقت یہ ہے کہ اقبالؒ کے الفاظ میں

خلق و تقدیر و ہدایت ابتدا ست
رحمۃ للعالمینی انتہا ست

ہماری اسمبلی کا پہلا کارنامہ

(سیاسی پارٹیوں کا قانون)

دگر از سر گرفتم قصۂ زلفِ چلیپا را

گذشتہ اوائل جون سے پاکستان کی تاریخ نے ایک نیا ورق الٹا ہے۔ مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کی تشکیل عمل میں آئی۔ مارشل لا کے اختتام سے ایک نئے دستور کا نفاذ ہوا اور اس طرح ملک میں ایک نئے آئینی دور کا آغاز ہو گیا۔ قومی امنگوں اور امیدوں کی اس جمہوری فضا میں ملک کے اہم ترین قانون ساز ادارہ (قومی اسمبلی) کے معزز ارکان راولپنڈی میں جمع ہوئے اور پورے ملک و ملت کی نگاہیں اپنے اس عبوری دارالسلطنت پر مرکوز ہو گئیں جہاں ملک کی بگڑی بنانے کے لئے قومی اسمبلی کے اجلاس ایک ماہ سے زیادہ عرصہ تک جاری رہے۔ ہماری پندرہ سالہ قانون سازی کی تاریخ میں شاید یہ اپنی نوعیت کا طویل ترین اجلاس تھا۔ یہ اجلاس جس دھوم دھام سے شروع ہوا اس کی مختلف نشستوں میں جوش و خروش کے جو ہنگامے بپا ہوئے۔ ایک دوسرے کے خلاف الزام بازیوں کے جو شاہکار منظرِ عام پر آئے، ہمارے نزدیک انہیں نہ تو کوئی قابلِ ذکر اہمیت حاصل ہے اور نہ ہی ان کالموں میں ان کا تذکرہ مقصود ہے۔ قومی اسمبلی کی کارفرمائیوں اور معرکہ آرائیوں میں اگر کوئی چیز وزن رکھتی ہے تو وہ فیصلے ہیں جو اس طویل مدت کی بحث و تمحیص اور گرم جوشیوں میں بروئے کار لائے گئے۔

اسمبلی کی اس نشست میں دو ہی اہم امور زیرِ بحث آئے۔ ایک صاحب نے یہ بل پیش کیا کہ موجودہ عائلی قوانین کو منسوخ کر دیا جائے۔ اور ایک تحریک یہ اٹھائی گئی کہ ملک میں سیاسی پارٹیوں کا احیاء کیا جائے۔ اول الذکر بل پر ابھی آخری فیصلہ نہیں ہوا۔ بل پر پہلے (مجوزہ) اسلامی مشاورتی کونسل کی رائے لی جائے گی

اور اس کے بعد اسے (غالباً) آئندہ نشست میں اسمبلی کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ سیاسی پارٹیوں کے احیاء یا تشکیل سے متعلق بل، اسمبلی میں پاس ہو گیا ہے۔

یہ اسمبلی اُس آئین کی رو سے وجود میں آئی ہے جس کی بنیادی شق یہ ہے کہ ملک میں کوئی ایسا قانون نہیں بنایا جائے گا جو اسلام کے خلاف ہو۔ اور قوم کی بدنصیبی ملاحظہ ہو کہ اس کی نمائندہ اسمبلی نے اپنی پہلی نشست میں جو دو اقدامات کئے وہ دونوں اسلام کے خلاف ہیں یعنی عائلی قوانین کی تنسیخ کی تحریک بھی اسلام کے خلاف۔ اور ملت کو پارٹیوں میں تقسیم کرنے کا قانون بھی اسلام کے خلاف۔

جہاں تک مروجہ عائلی قوانین کی شرعی حیثیت کا تعلق ہے اسی اشاعت میں ایک مفصل اور مبسوط مقالہ الگ شائع کیا جا رہا ہے۔ زیرِ نظر کالموں میں ہم صرف سیاسی پارٹیوں سے متعلق دینی نقطۂ نظر کی وضاحت پر اکتفا کریں گے۔ اور علیٰ وجہ البصیرت بتائیں گے کہ اسلامی نظام جس وحدتِ ملی کا داعی ہے اس میں مذہبی فرقوں کے لئے کوئی گنجائش ہے اور نہ سیاسی پارٹیوں کے لئے کوئی وجہ جواز۔ قرآن کریم تفرقہ بازی کو دین میں شرک قرار دیتا اور خدا کا عذاب بتاتا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ انتہائی دلدوز و جگر سوز حادثہ ہے کہ اس ہم میں وہ حضرات سب سے بڑھ کر سرگرمی کا ثبوت دے رہے ہیں جنہیں امت کی مذہبی امامت کا دعویٰ ہے۔ اور ستم بالائے ستم یہ کہ ان حضرات میں وہ طبقہ مقدمۃ الجیش کا فریضہ ادا کر رہا ہے جو پاکستان میں اقامتِ دین کا سب سے بڑا مدعی ہے۔ چنانچہ اس کی منظوری کے بعد سب سے پہلا بیان جو ہماری نظر سے گذرا ہے وہ اسی طبقہ کے راہنما، سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کا ہے جس میں وہ فرماتے ہیں۔

> سچ پوچھئے تو ملک میں سیاسی جماعت بنانے کا سب سے زیادہ حق اب ہمیں حاصل ہو گیا ہے۔ باقی جماعتیں تو رعایتاً اس امر کی مجاز ہوں گی کہ اپنی الگ تنظیم کر لیں۔
>
> (نوائے وقت ۱۶ جولائی ۱۹۶۲ء)

یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ سیاسی پارٹیوں کے خاتمہ سے مارشل لاء نے وحدتِ ملی کے جس اہم مقصد اور تقاضائے دین کی بجاآوری کا سامان پیدا کیا تھا اس کے درپے تخریب وہ حضرات ہیں جنہیں ملت کی نمائندگی اور مسلمانوں کی مذہبی امامت اور اجارہ داری کا فخر حاصل ہے۔ جیسا کہ قارئین کو معلوم ہے اس داستانِ غم کا تذکرہ طلوعِ اسلام کے صفحات پر پہلی بار نہیں چھیڑا گیا۔ ہماری یہ گذارشات وقتی مصلحتوں کی پروردہ ہرگز نہیں۔ گذشتہ پندرہ برس میں جب بھی وحدتِ ملت کے خلاف کوئی قدم ارباب اقتدار کی بارگاہ سے اٹھا ہم نے ہر مصلحت سے بالاتر رہتے ہوئے ہمیشہ دینی موقف کی نشان دہی کی اور کارفرمایانِ

مملکت کو بار بار اس خطرے سے آگاہ کیا جو سیاسی پارٹیوں اور مذہبی فرقوں کے وجود سے مملکت کو لاحق ہو سکتا ہے۔ اس موضوع پر شرح و بسط کے ساتھ ہم اس قدر لکھ چکے ہیں کہ اگر اُسے یکجا کر دیا جائے تو ایک ضخیم کتاب مرتب ہو جائے۔ ہماری ان تمام تصریحات کا نقطۂ ماسکہ ہمیشہ یہی رہا ــــ اور یہی رہیگا ــــ کہ

قرآن کریم کی رو سے پوری ملت اسلامیہ ایک پارٹی ہے اور اس کے اندر مختلف مذہبی فرقوں اور سیاسی پارٹیوں کا وجود کسی صورت میں جائز نہیں۔

اس سلسلہ میں اپنی ذاتی رائے پیش کرنے کے بجائے ہم نے ہمیشہ قرآن کریم کے آئینے کو مسلمانوں کے سامنے رکھ دیا۔ اس سے اور تو اور بعض ارباب مذہب کی طرف سے بھی شدید غم و غصہ کا اظہار کیا گیا، لیکن سوچئے کہ قرآن کے آئینے میں اپنے خط و خال دیکھ کر اگر کسی کو غصہ آجائے تو اس میں آئینہ یا آئینہ بردار کا کیا قصور؟ اس موقف کی تائید میں جہاں ہمارے سامنے قرآن کریم کے واضح ارشادات موجود ہیں وہاں اس دور کے درخشندہ حقائق بھی وجہ تابانی قلب و نظر ہیں جب دین اپنی حقیقی شکل میں قائم ہوا تھا۔ دین کا نظام نبی اکرمؐ والذین معہٗ کے مقدس ہاتھوں معرض وجود میں آیا۔ اس سے کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا۔ اس وقت مسلمانوں میں نہ کوئی مذہبی فرقہ تھا اور نہ سیاسی پارٹی۔ یہ اس وقت وجود میں آئے جب خدا کا دین انسانوں کے خود ساختہ مذہب میں تبدیل ہو گیا۔ اور اس کے بعد ہمارے ہاں جس قدر حکومتیں وجود میں آئیں وہ مسلمانوں کی حکومتیں تھیں، اسلام کی حکومتیں نہیں تھیں۔ انھوں نے ملت میں تفرقہ مٹانے کے لئے کوئی اقدام نہیں کیا۔ کیونکہ یہ تفرقہ ان کی سیاسی مصلحتوں کے لئے آبِ رحمت ثابت ہوا۔ اس لئے وہ اسے کیوں مٹاتے!

صدیوں کے بعد ہماری تاریخ میں یہ پہلا موقعہ ہے کہ ایک مملکت، "مسلمانوں کی مملکت" قرار پانے کے بجائے اسلامی مملکت کا مقام حاصل کرے۔ ایسی مملکت میں وحدت ملی کے خلاف سیاسی اور مذہبی تفرقہ بازی کی وہ معرکہ آرائیاں کیونکر روا رکھی جا سکتی ہیں جنہیں خدا کی آخری کتاب علی الاعلان شرک سے تعبیر کرتی ہے۔ مثلاً قرآن کریم نے مسلمانوں سے کہا ہے کہ

وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۔ مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا (۳۰/۳۲)

اور تم نے مشرکوں میں سے نہ ہو جانا۔ یعنی ان میں سے جنہوں نے اپنے دین[1] میں فرقے پیدا کر لئے اور پارٹیوں میں تقسیم ہو گئے۔

---

[1] جب قرآن "دین" کہتا ہے تو چونکہ اسلام میں مذہب اور سیاست دو الگ الگ شعبے نہیں اس لئے "دین" میں تفرقہ کے اندر مذہبی فرقے اور سیاسی پارٹیاں دونوں آجاتے ہیں۔

قرآن کریم اسی پر بس نہیں کرتا بلکہ وہ فرقوں اور پارٹیوں کے محرکین کا امت سے رشتہ کاٹ کر رکھ دیتا ہے چنانچہ اس کا ارشاد ہے کہ

إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا لَسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ (۶/۱۶۰)

جن لوگوں نے اپنے دین میں تفرقہ ڈالا اور الگ الگ گروہ بن گئے۔ اے رسول! تمہیں ان سے کچھ سروکار نہیں

اس نے مسلمانوں سے تاکید کر دی کہ

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ وَأُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ (۳/۱۰۴)

تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جو فرقوں میں بٹ گئے اور باہم دگر اختلافات میں پڑ گئے بعد اس کے کہ ان کے پاس واضح احکام (یا دلائل) آچکے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن کے لئے سخت عذاب ہے

قرآن آگے پڑھتا ہے اور بطور انتباہ ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ قوموں کی غلط روش کے باعث، قانون خداوندی کی رو سے، جو عذاب محسوس طور پر سامنے آتے ہیں، ان میں ایک عذاب عظیم پارٹیوں کا وجود بھی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلَىٰ أَنْ يَبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِنْ فَوْقِكُمْ أَوْ مِنْ تَحْتِ أَرْجُلِكُمْ أَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَيُذِيقَ بَعْضَكُمْ بَأْسَ بَعْضٍ (۶/۶۵)

(ان سے) کہو کہ وہ اس پر قادر ہے کہ تم پر اوپر سے عذاب بھیجے یا تمہارے پاؤں کے نیچے سے، یا تمہیں پارٹیاں بنا کر ایک دوسرے سے بھڑا دے اور تم میں سے ایک دوسرے کو لڑائی کا مزا چکھا دے

حیاتِ ملی کا راز اسی میں ہے کہ پوری امت فرقوں اور پارٹیوں سے بالاتر رہتے ہوئے ضابطۂ خداوندی سے اجتماعی طور پر تمسک رہے۔ اسی لئے افرادِ امت کو حکم دیا گیا کہ

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا ..... (۳/۱۰۳)

تم سب اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رہو اور تفرقہ مت پیدا کرو۔

اسلام ایک مخصوص تصورِ حیات کا داعی ہے اور اسی تصورِ حیات کی بنا پر فکر و عمل کی وحدت، ہم آہنگی

اور یک رنگی کا طالب۔ وہ قطعاً یہ گوارا نہیں کرتا کہ اس وحدت اور ہم آہنگی کو خیرباد کہہ کر افرادِ امت مختلف گروہوں، فرقوں اور پارٹیوں میں بٹ جائیں۔ اقبالؒ نے کس قدر درست کہا تھا کہ

چیست ملت آئے کہ گوئی لا الٰہ ؟
با ہزاراں چشم بودن یک نگاہ

خدا کے نزدیک یہ وہ روش ناقابلِ برداشت اور مذموم ہے جو امت کی اس یک رنگی کو خطرے میں ڈال دے چنانچہ مسلمانوں کو تاکیداً رسولِ خدا کی زبانِ مبارک سے کہلایا گیا کہ

وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِیْلِهٖ (۶/۱۵۳)

(ان سے کہہ دو کہ) یہ ہے میری سیدھی راہ۔ اس پر چلو۔ اور مت چلو اور راستوں پر کہ وہ تمہیں اس کی راہ سے الگ کر دیں گے

آخر یہ "اور راستے" ان فرقوں اور پارٹیوں کے سوا اور کیا ہیں جو افرادِ امت کو الگ الگ مسالک کے پیروکار بنا کر ایک دوسرے سے جدا ہی نہیں کر دیتے بلکہ ایک دوسرے کے دشمن بنا دیتے ہیں۔ فرقوں اور پارٹیوں کی جنگ و جدل اور ٹکراؤ سے آجتک امت کو جن تباہ کاریوں سے دوچار ہونا پڑا ان کی شہادت ہماری تاریخ کے صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔

خود اپنے متعلق قرآن کا دعویٰ یہ ہے کہ یہ کتاب نوعِ انسانی کے تمام اختلافات کو ختم کرنے آئی ہے جبکہ وہ خود اپنے ماننے والوں میں فرقوں اور پارٹیوں کے اختلافات پیدا کر کے ان میں مستقل طور پر افتراق و انشقاق کا جہنم بھڑکا دے۔ اسی دعوے کے سلسلے میں فرمایا گیا۔

وَمَا اَنْزَلْنَا عَلَیْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَیِّنَ لَهُمُ الَّذِی اخْتَلَفُوْا فِیْهِ وَهُدًی وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ (۱۶/۶۴)

اور ہم نے تجھ پر یہ کتاب اس لئے نازل کی ہے کہ ان امور کو ظاہر کر دے جن میں یہ لوگ اختلاف کرتے ہیں۔ (یہ کتاب) ان لوگوں کے لئے جو اس پر ایمان لائے ہدایت اور رحمت ہے۔

یہ ہیں خدا کی اس آخری کتاب کے واضح احکام اور روشن ہدایات جس کا ایک ایک لفظ مسلمانوں کے ایمان کی بنیاد ہے اور جس پر ان کے پورے نظامِ حیات کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ اس کے باوجود اگر کوئی فرد یا گروہ اس پر مصر ہے کہ فرقوں اور پارٹیوں کے بغیر چارہ کار نہیں تو اسے پوری طرح سوچ لینا چاہیئے کہ ایسا سمجھنے اور

کرنے کے لئے اس کے ہاں کونسی سند موجود ہے اور اس کے لئے کونسی وجہ جواز؟ یہی نہیں بلکہ اُسے کھل کر میدان میں آنا چاہیئے۔ اُسے بتانا ہوگا کہ مسلمانوں کی نمائندگی، شریعت کی پیشوائی اور اقامتِ دین کی اجارہ داری کے بلند بانگ دعووں کی موجودگی میں پارٹیوں کے احیاء و اجراء کی مہم چلا کر وہ دینِ خداوندی کی کونسی خدمت انجام دے رہا ہے؟ اُسے بدلائل و براہین ثابت کرنا ہوگا کہ قرآن کے ان واضح احکام کو چیلنج کرنے کا حق اُسے کس بارگاہ سے حاصل ہوا ہے؟ ہم اُن تمام عناصر کو جو ایک طرف پاکستان میں احیائے نظامِ اسلامی کے لئے مضطرب نظر آتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی سیاسی پارٹیوں کے احیاء کے لئے بھی بیقرار ہیں، چیلنج کرتے ہیں کہ وہ اپنے اس متضاد موقف کی تائید میں کوئی قرآنی دلیل اور وجہ جواز پیش کریں۔ ہم پورے دعوے سے کہتے ہیں کہ وہ ہرگز ہرگز ایسا کرنے کے قابل نہ ہو سکیں گے۔

پھر جب علیٰ رؤس الاشہاد یہ واضح ہے کہ ایک مسلمان کی حیثیت سے قرآن کے ان کھلے کھلے احکام کو چیلنج کرنا ممکن نہیں تو پھر ہم پوچھتے ہیں ان معزز ارکان اسمبلی سے جنھوں نے یہ حلف اٹھائے ہیں کہ اسلام کے خلاف کوئی قانون وضع نہیں کیا جائے گا اور پوچھتے ہیں ان ارباب شریعت اور اقامتِ دین کے علمبرداروں سے جو اسلام کی نمائندگی کے مدعی ہیں کہ سیاسی پارٹیوں کے احیاء کے سلسلے میں انھوں نے ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر جو سرگرمی دکھائی ہے کیا وہ احکامِ خداوندی کے اتباع و اطاعت پر مبنی ہے یا ان کے انحراف و بغاوت پر؟ یہ شریعت حقہ کی ترجمانی اور پاسبانی ہے یا کھلے بندوں اس سے روگردانی؟

ہم نے فضا میں گونجتے ہوئے ان نعروں کو سنا ہے کہ اسلام سراسر جمہوریت ہے اور جمہوریت کے نشوونما کے لئے سیاسی پارٹیوں کا وجود ناگزیر ہے۔ یہ نعرے ملت کے ساتھ بہت بڑے فریب کے مرادف ہیں۔ ہم اس سے پہلے متعدد بار اس فریب کی نقاب کشائی کر چکے ہیں لیکن اب جبکہ یہ موضوع پھر سامنے آگیا ہے، تو ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ اس حقیقت کو ایک بار پھر دہرا دیں۔ یاد رکھیئے کہ جمہوریت کا ایک تصور تو وہ ہے جو مغرب کی سیکولر سیاست کا شاہکار اور ان دنوں ساری دنیا میں رواج پا رہا ہے۔ یہ تصور اسلام کے عطا فرمودہ تصورِ جمہوریت سے سراسر مختلف ہے۔ اور اس اختلاف باہمی کی بنیادی شق یہ کہ جمہوریت کے مغربی تصور میں کوئی چیز حق مطلق (ABSOLUTE TRUTH) نہیں۔ جو کچھ کثرت رائے سے پاس کر دیا جائے وہ حق و صداقت بن جاتا ہے لیکن اسلام کا تصورِ جمہوریت اپنے نظام کیلئے خارجی، مستقل اور مطلق معیار قائم کرتا ہے۔ یہ معیار جمہوری اور غیر جمہوری بحث سے بالاتر ہے اور اسے ساری دنیا کے انسان مل کر اتفاق رائے سے بھی بدل نہیں سکتے۔

اس اٹل اور لازوال حقیقت کی روشنی میں قیام پاکستان کے مقصود و منتہا کو سامنے لائیے۔ یہ مملکت ایک نظریاتی مملکت کی حیثیت سے معرض وجود میں آئی ہے۔ اور جن نظریات پر اس کی اساس قائم ہے وہ ایک مسلمان کے لئے ایمان کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان نظریات میں کوئی تبدیلی پیدا کرنا تو درکنار انہیں زیر بحث تک نہیں لایا جا سکتا۔ ان میں اختلاف پیدا کرنے کی کوئی گنجائش ہی موجود نہیں اور نہ کسی فرد مملکت کو اس کا حق حاصل ہے۔ جب صورت یہ ہو تو پھر ...... پاکستان میں سیاسی پارٹیوں کے وجود کو اس لئے ناگزیر قرار دینا کہ یہ مغرب کے جمہوری نظام کا جزو (ٹھیک ہیں) پاکستان کے بنیادی مقصد و منتہی کی کھلی ہوئی مخالفت اور تلبیس حق و باطل ہے۔ یا تو اسے ثابت کیجئے کہ اسلام کی رو سے امت میں تفرقہ اسلامی نظام کے لئے ناگزیر ہے۔ اور اگر آپ اسے ثابت نہیں کر سکتے —— بلکہ اس کے برعکس قرآن کے واضح ارشادات ہمارے سامنے موجود ہیں —— تو پھر اس پر اصرار کرنا اسلام سے کھلی ہوئی دشمنی نہیں تو اور کیا ہے؟ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ اسلام جب تک اپنی حقیقی شکل میں کارفرما رہا، ملت میں نہ کوئی مذہبی فرقہ قائم ہو سکا اور نہ سیاسی پارٹی وجود میں آسکی۔ غور فرمایئے کہ اگر ایک اسلامی نظام مملکت میں بھی (مغربی نظام جمہوریت کی طرح) پارٹیوں کا وجود ناگزیر ہوتا تو نبی اکرم کو حضرت صدیق اکبرؓ یا دیگر صحابہ کبارؓ سے کہنا چاہیئے تھا کہ وہ "جمہوریت کے تقاضوں کے لئے" (معاذ اللہ) اپوزیشن پارٹیاں قائم کر لیں۔ اسی طرح خلیفہ اول کے لئے بھی ضروری تھا کہ وہ فاروق اعظمؓ اور دیگر رفقائے جلیل سے کہتے کہ چونکہ نظام مملکت کا جمہوری فروغ پارٹیوں کے بغیر ممکن نہیں اس لئے وہ حکومت کے مقابلے میں اپنے اپنے حزب مخالف قائم کر لیں۔ صاف ظاہر ہے کہ اسلام کے نظام مملکت میں ایک لمحے کے لئے بھی کبھی اس قسم کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی اور پارٹیوں کی ضرورت سے بے نیاز اور بالاتر رہ کر دنیا کا یہ عظیم ترین مثالی نظام تاریخ انسانی میں وہ عظمت آفریں درخشندہ نتائج پیدا کر گیا جن کی مثال تاریخ عالم نہ اس سے قبل پیش کر سکی اور نہ آئندہ کر سکے گی۔

سوچنے کا مقام ہے کہ جب ہم انہی درخشندہ خطوط پر اپنی اسلامی مملکت کے قیام کے مدعی اور آرزومند ہیں تو پھر آج نبی اکرمؐ اور ان کے خلفائے راشدین کی سنت اور قرآن کے ارشادات سے انحراف اختیار کر کے سیاسی پارٹیوں کے احیاء و قیام کی ضرورت کیونکر پیدا ہو گئی؟ ہمارے ہاں کی ایک بڑی بدنصیبی یہ بھی تو ہے کہ ہم مغربی تصورات میں اس حد تک کھوئے گئے ہیں کہ وہاں کے مروجہ نظام جمہوریت کی تنگنائے سے باہر نکل ہی نہیں سکتے۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ اس نظام میں پارٹیوں کا وجود ضروری ہے تو پھر جمہوریت کے مغربی فلسفہ اور اس کے اسلامی تصور کا بنیادی فرق سمجھے بغیر ہم یہ ہانک لگا دیتے ہیں کہ ہمارے ہاں

بھی سیاسی پارٹیوں کا وجود اشد ضروری ہے۔ سوچئے کہ یہ کتنا بڑا فریب ہے خود اپنے ساتھ اور کتنا بڑا کھیل ہے دینِ خداوندی کے ساتھ!

ستم بالائے ستم یہ ہے کہ ان تلخ تجربات کے تباہ کن نتائج ہماری نگاہوں کے سامنے آچکے ہیں۔ ہمارے ہاں (اور مغرب میں بھی) پارٹیوں کا مسلک و مقصد یہی ہوتا ہے کہ ہر معاملے میں حزبِ اقتدار کی مخالفت کی جائے اور جیسے بھی ممکن ہو برسرِ اقتدار پارٹی کی حکومت کا تختہ الٹ کر اپنی پارٹی کی حکومت قائم کی جائے۔ اس مقصد و مسلک کے لئے ملک کی تمام پارٹیاں ایک دوسرے کے خلاف شب و روز نبرد آزما اور برسرِ پیکار رہتی ہیں۔ اور پوری مملکت میں جنگ و جدل کا ایک جہنم ہر لحظہ بھڑکتا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس قسم کا نظام، اسلامی تصورِ مملکت میں کبھی بار نہیں پا سکتا۔ ہم نے گیارہ برس یہ جہنم بھڑکا کے دیکھ لیا۔ اس کے شعلوں میں پوری ملت کا امن و چین بھسم ہو کے رہ گیا۔ تقلیدِ مغرب کی اس خود فریبی میں ہمیں بدترین ایام دیکھنے پڑے۔ لیکن وائے برحال ما کہ ہم اس سے ادنیٰ عبرت حاصل نہ کر سکے اور جونہی موقعہ ملا ماضی کے تلخ تجربات کو ایک بار پھر دہرانے کے لئے بے تابانہ میدان میں نکل آئے۔

ایک بار پھر سن لیجئے کہ اسلامی مملکت کے نظام کی بنیاد وحدتِ ملت پر ہے۔ اس نظام میں نہ تو کسی ایک پارٹی کی حکومت کی گنجائش ہوتی ہے اور نہ کسی دوسری کی نگرانی اور احتساب کا سوال۔ حکومت کا قیام پوری ملت کا مشترکہ فریضہ ہوتا ہے اور ہر فردِ مملکت کو اس کی نگرانی کا حق حاصل ہوتا ہے۔ اس مملکت کی پالیسی میں جو مسائل بھی زیرِ بحث آتے ہیں ان میں نگرانی کسی فرد یا پارٹی کے لئے مخصوص نہیں ہوتی بلکہ یہ نگرانی درحقیقت دین کے بنیادی اصولوں کی ہوتی ہے جن کے دائرہ کار سے باہر جانے کا حق نہ کسی فرد کو ہوتا ہے نہ پارلیمان کی کثرتِ رائے بلکہ اتفاقِ رائے کو۔ ہمیں حیرت ہے کہ ہمارا مذہبی طبقہ جو چھوٹی چھوٹی جزئیات تک میں تو اتباعِ سنت پر زور دیتا ہے، دین کے اس قدر اہم اور بنیادی مسئلہ میں اتنا بھی نہیں سوچتا کہ حضور نبی اکرمؐ کے دورِ ہمایوں میں کسی فرقے اور پارٹی کا نام و نشان تک نہیں ملتا۔ اگر ہمارے لئے آئیڈیل راسوۂ حسنہ، اسی دور کا نظام ہے تو پھر آج اس اسوۂ حسنہ سے انحراف اور بغاوت کیوں؟ اس زمانے میں قرآن کریم کے ارشاد کے مطابق دنیا میں دو ہی پارٹیاں تھیں ــــ مسلم اور غیر مسلم ــــ خود مسلمانوں میں کسی پارٹی کا وجود یا تصور نہ تھا۔ وہاں ایک حزب اللہ تھا اور دوسری حزب الشیطان۔ "حزب اللہ" کے اندر مختلف احزاب کا تصور اسلام کی بنیادی تعلیم کے خلاف تھا۔ اگر مغربی نظامِ جمہوریت میں پارٹیوں کا وجود ناگزیر ہے تو ہمیں مغربی جمہوریت کو اسلامی جمہوریت میں تبدیل کرنا چاہیئے۔ نہ کہ مغربی جمہوریت

کو آسمان سے نازل شدہ تسلیم کرکے، اسلام کے بنیادی تصورِ وحدت کو خیرباد کہہ دینا چاہیئے۔

بہرحال یہ ہے وہ قانون جو ہماری اسمبلی نے منظور کیا ہے اور جس پر ایوان کے اندر اور ارکانِ اسمبلی، اور اس کے باہر ارباب سیاست و شریعت، فرحاں و نازاں ہیں کہ

شادم از زندگیٔ خویش کہ کارے کردم

یہ ابھی اس اسمبلی کی ابتدا ہے ـــــ آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا؟

(صفحہ ۸ کا باقی رابطہ باہمی)

جلد ہی ان کی رسم افتتاح ادا کی جا رہی ہے۔ محترم صوفی عبدالرحمان صاحب مکتبہ کے ناظم مقرر ہوئے ہیں دارالمطالعہ میں ہر اتوار کی صبح کو درس قرآن کا اہتمام کیا جا رہا ہے۔ اس کے ساتھ ہی عربی کی کلاس کا بھی باقاعدہ افتتاح کیا جائے گا۔

پشاور

پرویز صاحب کا درس قرآن ٹیپ ریکارڈ سے ہفتہ وار سنایا جاتا ہے۔ دیگر حلقہ بزمیں بھی اس سے مستفید ہو رہی ہیں۔ اور اس طرح قرآن کی یہ آواز چاروں طرف پھیلتی جا رہی ہے

بوریوالہ (ضلع ملتان)

مقامی بزم کے سرگرم ارکان کچھ عرصہ یہاں سے باہر رہے اس لئے بزم کے اجتماعات کی رونق قدرے کم رہی۔ لٹریچر کی تقسیم اور قرآنی فکر کی نشر و تبلیغ کا سلسلہ منظم طور پر جاری ہے۔

سید حسین (ضلع جہلم)

بزم کے اجلاس باقاعدگی سے جاری ہیں۔ پمفلٹ ـــ کافرگری ـــ یہاں کافی تعداد میں تقسیم کیا گیا ہے اور اس نے کافی اثر پیدا کیا ہے۔ مطالعہ کے لئے لائبریری سے کتابوں کی تقسیم بھی کی جا رہی ہے۔

راولپنڈی

ہر جمعہ کو چار بجے شام الکوثر میں بزم کی طرف سے باقاعدہ اجتماع کا اہتمام ہوتا ہے جس میں پرویز صاحب کے درس قرآن کا ٹیپ سنایا جاتا ہے اور ان کی دیگر اہم تقاریر بھی۔ اسباب زوال امت کے تین سو نسخے اور دیگر تازہ پمفلٹ تقسیم کئے گئے۔ اس سے یہاں کی فضا میں دور رس اثرات سامنے آ رہے ہیں اور مخالفین کے غلط پروپیگنڈہ کا پردہ چاک ہو رہا ہے۔ نمائندہ بزم نے ہر ہفتے واہ کینٹ میں بھی پرویز صاحب کی تقریروں کے ٹیپ سنانے کا اہتمام کر رکھا ہے۔ سب کنونشن کی تیاریاں شروع ہیں۔

رابطۂ باہمی

(۱) بزم ہائے طلوعِ اسلام کے نام

ملک میں آئینِ نو کے نفاذ، اور اس کے تحت مجالسِ قوانین ساز کی تشکیل کے بعد، ہماری قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کی تحریک، ایک نئے مرحلہ میں داخل ہوئی ہے۔ اس سے پہلے ہم قرآنی فکر کو عوام کے سامنے لاتے تھے، تاکہ ان کے ذہن غیر قرآنی تصورات سے پاک ہو کر صحیح قرآنی تعلیم کو اپنا سکیں۔ اب ملک میں قوانین سازی کا کام شروع ہو رہا ہے اور آئینِ نو میں یہ شق موجود ہے کہ یہاں کوئی ایسا قانون نافذ نہیں ہو گا جو اسلام کے خلاف ہو۔ یہ ظاہر ہے کہ جو قانون قرآن کے خلاف ہو گا وہ کبھی اسلام کے مطابق نہیں ہو سکتا۔ اس لئے اب ضرورت ہو گی کہ مجالسِ قوانین ساز کے اراکین اور اربابِ حل و عقد کو بالخصوص اور ملک کے دوسرے ذمہ دار طبقہ کو بالعموم بتایا جائے کہ کونسا قانون قرآن کے مطابق ہے اور کونسا خلاف۔ ملک میں مختلف جماعتیں (پارٹیاں) اور ادارے اپنے اپنے پروگرام کے مطابق، جو کچھ کر رہے ہیں (یا کرنا چاہتے ہیں) ہمیں اس سے سروکار نہیں، لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس وقت پاکستان میں (اور اگر ہماری معلومات صحیح ہیں تو تمام ممالک اسلامی میں) طلوعِ اسلام کے علاوہ کوئی ایسا ادارہ نہیں جو پیش آمدہ معاملات کے متعلق یہ بتائے کہ اس باب میں قرآنِ کریم کا کیا فیصلہ ہے — اور اس میں اس کے پیشِ نظر کوئی ذاتی مفاد نہ ہو۔ (ایسے حالات، اس نئے مرحلہ میں، ہمارے سر پر جو ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، ان کی وضاحت کی ضرورت ہے اور نہ ہی اس کے متعلق کچھ تاکیداً کہنے کی حاجت۔ بزموں کے احباب ان سے واقف بھی ہیں اور

اپنی ذمہ داری کا احساس بھی رکھتے ہیں۔ پروگرام یہ ہوگا کہ جو مسئلہ بھی ملک کے سامنے پیش آئے گا، اس کے متعلق قرآنی تعلیم کی وضاحت طلوعِ اسلام میں کی جائے گی (جسے عند الضرورت پمفلٹ کی شکل میں بھی شائع کیا جائے گا)۔ بزموں کا کام یہ ہوگا کہ اس تعلیم کو ملک کے سنجیدہ، اہلِ فکر و نظر طبقہ تک زیادہ سے زیادہ وسعت کے ساتھ پہنچائیں۔ یہ پمفلٹ بلا قیمت تقسیم کئے جائیں گے۔ مثلاً اس اشاعت میں ذیل کے مضامین بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔

(۱) نذرِ عقیدت بحضور رسالتمآبؐ۔ اس کا پمفلٹ بزموں کو بھیجا جا رہا ہے جو بتقریبِ سعید عید میلاد النبیؐ تقسیم ہوگا۔

(۲) عائلی قوانین (قرآن کریم کی روشنی میں)۔ اس کا بھی پمفلٹ بزموں کو بھیجا جا رہا ہے جسے متعلقہ حلقوں میں خاص طور پر تقسیم کیا جائے۔

(۳) ہماری اسمبلی کا پہلا کارنامہ ——— سردست اس کا الگ پمفلٹ شائع نہیں کیا گیا لیکن اس مقالہ میں پیش کردہ قرآنی تعلیم کے عام کئے جانے کی ضرورت ہے۔

(۴) لمعات میں ایک بڑے اہم موضوع پر گفتگو کی گئی ہے۔ اسے ذمہ دار حضرات کے نوٹس میں لانے کی ضرورت ہے۔

اسی قسم کا سلسلہ برابر جاری رہے گا۔

(۲) رسالہ طلوعِ اسلام کے علاوہ ادارہ کی مطبوعات کا عام کرنا بھی نہایت ضروری ہے۔ یہ مطبوعات اب بیزن پبلی کیشنز کی طرف سے شائع ہوتی ہیں (اور ان کے متعلق انہی سے براہ راست خط و کتابت کرنی چاہیئے نہ کہ ادارہ سے)۔ مثلاً حال میں دو اہم کتابوں کے نئے ایڈیشن شائع ہوئے ہیں ———

(۱) اسبابِ زوالِ امت۔ اور

(۲) دو اہم مسائل۔ (۱) قتلِ مرتد۔ اور (۲) غلام اور لونڈیاں۔

ان کی زیادہ سے زیادہ اشاعت کی ضرورت ہے۔

علاوہ ازیں مفہوم القرآن، بڑی بنیادی چیز ہے۔ اسے جس قدر عام کیا جائے، کم ہے۔ اس سے سوچنے والے طبقہ کے قلب و دماغ کی تعمیر قرآنی خطوط پر ہو سکے گی۔

(۳) اسے ایک مرتبہ پھر دہرا دینا ضروری ہے کہ طلوعِ اسلام نہ کوئی سیاسی پارٹی ہے اور نہ ہی مذہبی فرقہ ——— نہ ہی اسے کسی سیاسی پارٹی یا مذہبی فرقہ سے تعلق ہے۔ اس کی حیثیت بس یوں سمجھئے جیسے (مثلاً) "بزمِ اقبال"۔

بزمِ اقبال، کا مقصد پیغامِ اقبالؒ کی نشر و اشاعت ہوتا ہے۔ بزمِ طلوعِ اسلام کا مقصد قرآنی فکر کی نشر و اشاعت ہے (پیغامِ اقبالؒ خود اس کے اندر آجاتا ہے)۔ اس نشر و اشاعت میں اس بات کا خاص طور پر خیال رکھنا چاہیئے کہ کسی سے جھگڑا یا مناظرہ قطعاً نہ کیا جائے۔ آپ مثبت طور پر قرآنی پیغام کو عام کرتے جائیں اور کسی سے کسی معاملہ میں، قطعاً نہ الجھیں۔ کسی سے الجھنا ہمارا مقصد ہی نہیں ــــ بلکہ ہمارے مقصد کے منافی ہے۔ ملک کے قوانین و ضوابط کا احترام، اور آدابِ معاشرت کا لحاظ رکھتے ہوئے، پُرامن شہریوں کی طرح، نہایت متین اور سنجیدہ انداز میں، اس فکر کو عام کرتے جایئے۔ اس کے ساتھ اسے بھی یاد رکھیئے کہ قرآنی فکر کی سب سے زیادہ موثر تبلیغ، لوگوں کے ساتھ آپ کے حسنِ سلوک اور خوش معاملگی کے ذریعے ہو سکتی ہے۔ خالی الفاظ کبھی اتنا اثر نہیں کر سکتے جتنا اثر ان کا حسنِ عمل کرتا ہے۔

(۴) ہماری نگاہیں افقِ عالم پر ہیں۔ حالاتِ قرآنی فکر کے لئے بڑے سازگار ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ سمجھنے سوچنے والا طبقہ اس کے قریب آتا جا رہا ہے۔ متجسس نگاہیں خود اس کی تلاشی ہیں۔ کمی ہماری طرف سے ہے کہ ہم اس پیغامِ حیات کو ان لوگوں تک کما حقہ پہنچا نہیں رہے۔ تھوڑی سی ہمت اور کیجئے۔ خدا کی تائید و نصرت آپ کے شاملِ حال ہوگی اور منزل کھنچکر آپ کے قریب آجائے گی۔ آپ کے نام قرآن کا پیغام یہ ہے کہ

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ ــــ اپنے نشو و نما دینے والے کی طرف مسلسل اور پیہم دعوت دیتے چلے جاؤ لیکن اس میں شرط یہ ہے کہ وَلَا تَکُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ۔ پیغامِ خداوندی میں اپنے، یا کسی اور انسان کے کسی خیال، نظریہ، یا رجحان کو شریک نہ کرو۔ یہ شرک ہے۔ وَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰہِ اِلٰھًا اٰخَرَ۔ اللہ کے ساتھ کسی اور کو صاحبِ اقتدارِ تسلیم نہ کرو۔ قانون اسی کا قانون ہے، اور فیصلہ اسی کا فیصلہ۔ یہ قانون اور فیصلہ اس نے اپنی کتاب میں محفوظ کر دیا ہے۔ لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ۔ اس کے سوا کسی اور کا قانون اور فیصلہ واجبِ التسلیم نہیں۔ اس لئے کہ کُلُّ شَیْءٍ ھَالِکٌ اِلَّا وَجْھَہٗ۔ کائنات کی کوئی شے ہو یا انسانی خیالات و نظریات۔ ان میں سے ہر ایک تغیر پذیر ہے۔ تغیر و تبدل سے ماورا صرف خدا کی طرف سے متعین کردہ راستہ ہے۔ لَہُ الْحُکْمُ وَاِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ (۲۸/۸۸)۔ لہٰذا ہر معاملہ کا فیصلہ اس کی بارگاہ (قرآن) سے طلب کرو، اور اپنے آپ کو اس کے سامنے جوابدہ تصور کرو۔

یہ ہے آپ کے نام قرآن کا پیغام۔ اللہ آپ کو اس پیغام پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ والسلام۔

بزموں کی ماہانہ رپورٹیں

لندن

۸ر جولائی کو بزم کا ماہانہ اجلاس چغتائی صاحب کے دولت کدہ (20-HOWARD WALK, LONDON, N-2) پر ہوا۔ اس اجلاس میں محترم ڈار صاحب اور بیگم ڈار صاحبہ نے جو کینیا سے انگلستان تشریف لائے ہیں، شرکت کی۔ بیگم ڈار صاحبہ قرآنی فکر سے دلی وابستگی اور اس پر گہرا عبور رکھتی ہیں۔ پرویز صاحب کا ٹیپ ریکارڈ (شفاعت کسے کہتے ہیں؟ کے موضوع پر) سنایا گیا۔ بعد ازاں اس پر پروفیسر فلام فرید صاحب اور محترم ڈار صاحب کی بحث و تمحیص کافی موثر ثابت ہوئی۔ موسم گرما کی تعطیلات کی وجہ کی اجلاس میں طلبار کی تعداد کم تھی۔ لٹریچر کی تقسیم کے اثرات کافی ترقی پذیر ہیں اور انگلستان کے مختلف حصوں سے ایسے خطوط آرہے ہیں جس میں طلوعِ اسلام کی پیش کردہ فکر قرآنی سے بڑی دلچسپی کا اظہار کیا جارہا ہے۔ طلوعِ اسلام کی خریداری اور تحریک کی رکنیت قبول کرنے کا شوق بھی بڑھ رہا ہے۔

لیہ (ضلع مظفر گڑھ)

بزم کا ماہانہ اجتماع ۲ر جولائی کو ہوا۔ پمفلٹوں (مثالی مملکت۔ اسلام کیا ہے؟ شعلۂ نمناک اور کافر گری) کی تقسیم گہرے اثرات پیدا کر رہی ہے۔ "اسباب زوالِ امت" کا سستا ایڈیشن تیزی سے فروخت ہو رہا ہے۔ ماہنامہ طلوعِ اسلام کی خریداری بھی بڑھ رہی ہے۔ بزم کے اجلاس میں ایک قرارداد کی صورت میں متفقہ طور پر اس رائے کا اظہار کیا گیا کہ جب اسلامی مشاورتی کونسل قائم ہو تو عائلی قوانین کا فیصلہ کرتے ہوئے ملک کے سربرآوردہ مفکرینِ اسلام کو موقع دیا جائے کہ وہ کونسل کے سامنے اس بارے میں "دینِ خداوندی کے منشاء کو وضاحت سے پیش کر سکیں۔

میانوالی

یہ بزم جو حال ہی میں قائم ہوئی ہے بڑی تیزی سے ترقی کر رہی ہے۔ اراکین بزم منظم صورت میں قرآنی فکر کی نشر و اشاعت میں سرگرم کار ہیں۔ مختصر سی مدت میں اراکین بزم کی تعداد تیس کے قریب پہنچ گئی ہے اور جب یہ سلسلہ سو تک پہنچ گیا تو مفکرِ قرآن کو یہاں تشریف لانے کی دعوت دی جائے گی۔ طلوعِ اسلام کے لٹریچر کو عام کیا جارہا ہے۔ اس مقصد کے لئے "دارالمطالعہ افکار نو" اور "مکتبہ افکار نو" کا قیام عمل میں آگیا ہے اور

(باقی صفحہ پر ملاحظہ فرمائیے)